آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

نئی دہلی

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اپریل 2026

www.urducouncil.nic.in

قیمت : ₹ 15/-

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

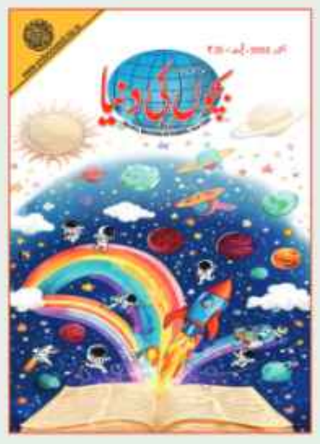

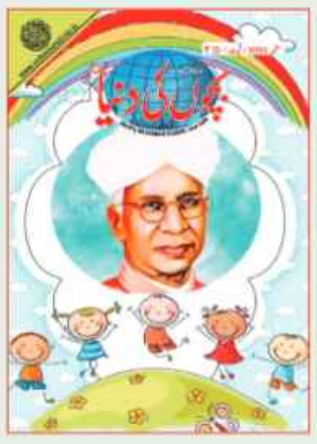

ان کے علاوہ:

- کہکشاں
- زبان شناسی
- میرا بچپن
- بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ
- ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے　　سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
نئی دہلی
Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد: 10 شمارہ: 4 اپریل 2026

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: میکاف پرنٹرس، B-127، سیکٹر 65
نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/15 روپے، سالانہ -/145 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 011-35151993
شعبۂ ادارت: 011-35152009
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل — مدیر — 4

شخصیات

جیلانی بانو کی ادبی وفکری وراثت کا تنقیدی جائزہ — مفتی سہیل ندوی — 5

روبرو

مسرور جہاں سے اسلم جمشید پوری کی گفتگو — اسلم جمشید پوری — 11

جہان نسواں

نسائی شاعری کی معتبر شاعرہ: رفیعہ شبنم عابدی — شعیب انصاری — 17

جوہر مگہری اور ان کی نظم 'عورت' — مصباح انصاری — 22

ناول 'تین بتی کے راما' کا فکری وفنی جائزہ — نزہت فاطمہ — 26

ایران اور ہندوستان میں ناول نگاری کا آغاز وارتقا — منیرہ اختر — 30

'پوکے مان کی دنیا' عصری آشوب اور ورچوئل رئلٹی کا بیانیہ — صوفیہ پروین — 34

ساجدہ زیدی کی خودنوشت 'نوائے زندگی' کا تجزیاتی مطالعہ — عنب شمیم — 40

حمید تمنائی کی غزل گوئی — سعدیہ پروین — 45

حسن سخن

غزل — مسرور صغریٰ — 49

نظم — تنویر کوثر — 49

افسانے

گھر کی زینت — یاسمین اختر — 50

بدلتی تقدیریں — رضیہ سلطانہ — 54

ایک جھپکی — عذرا انجم — 60

مشعل

بچے ملک وقوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ یہ سرمایہ ہر لحاظ سے تندرست وتوانا ہوگا تو یہی ملک کی تعمیر وتشکیل میں مثبت کردار ادا کرے گا اس لیے اس کی حفاظت لازمی ہے۔ یہی بچے آنے والی نسلوں کے نمائندہ وحکمراں ہوں گے اس لیے ان نسلوں اور فصلوں کی آبیاری کے لیے ضروری ہے کہ مٹی کو زرخیز بنایا جائے۔ وہ مٹی اور کھیت قوم کی مائیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ بچوں کا پہلا مکتب ماں کی گود ہے نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر مائیں تعلیم یافتہ ہوں گی تو مہذب وتعلیم یافتہ نسل تیار ہوگی اور تعلیم یافتہ نسل ضمانت ہے اچھے شہر وشہری کی۔ سیاسی کرداروں، تعلیمی اداروں کا فرض ہے کہ اچھی قوم تیار کرنے کے لیے طبقۂ نسواں کو تعلیم یافتہ کیا جائے۔ اس بابت حکومت ہند کے شعبۂ اعلیٰ تعلیم نے جہاں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں بڑے بڑے ادارے بھی کھولے ہیں انھیں اداروں میں قومی اردو کونسل حکومت ہند کا ایک خودمختار ادارہ ہے جو بحسن وخوبی اس کام کی انجام دہی کے لیے کوشاں ہے۔ اردو زبان صرف ایک زبان نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیب کا نام ہے۔ یہ تہذیب جہاں نفاست و نستعلیقیت، پیار ومحبت حلاوت وشیرنی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے وہیں ایثار وقربانی کے جذبے سے مملو ولبریز ہے۔

اپریل ماہ کا شمارہ اس لحاظ سے بہت خاص ہوجاتا ہے کہ اس میں بہت ساری تحریکات سے روبہ رو کرایا گیا ہے جیسے عالمی صحت، آرٹ، ماحولیاتی تحفظ، سماجی مساوات اور ادب۔ اچھے جسم میں اچھا دماغ ہوتا ہے نیز اچھے دماغ سے اچھے ملک کی تشکیل وتعمیر ہوتی ہے۔ اس لیے 7 اپریل کو عالمی یوم صحت کے طور پر منایا جاتا ہے۔ 14 اپریل کو امبیڈکر جینتی منائی جاتی ہے جو ہمیں آئین ہند کی پاسداری وتذکیر کراتی ہے۔ اسی طرح سے عالمی یوم آرٹ 15 اپریل، پرتھوی دیوس/ارتھ ڈے 15 اپریل اور 23 اپریل کو ورلڈ بک اینڈ کاپی رائٹ ڈے منایا جاتا ہے۔

مذکورہ ایام کو شمار کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا وزمین کو سرسبز وشاداب کرنے کے لیے ماؤں کو وہ مواد ملے جس کی مدد سے وہ اپنے بچوں کے اندر حسن وشجاعت پیدا کرسکیں مذکورہ تمام ایام ہماری زندگی کے تمام شعبوں کے لیے لازم ہیں۔ اچھی صحت، اچھا ماحول، اچھا سماج اور قانون کی پاسداری ہی ہماری خوشحال زندگی اور پرسکون زندگی کا آلہ و ذریعہ ہے۔ ایسے تعلیم یافتہ سماج میں کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی۔ جہاں حق تلفی نہیں ہوگی وہاں انصاف ہوگا، جہاں انصاف ہوگا وہاں بے چینی نہیں ہوگی اور جہاں بے چینی نہیں ہوگی وہاں خلفشار و بدامنی اور طوائف الملوکی نہیں ہوگی اور یہی پیغام ہے آسمانی صحیفوں کا کہ ہر ایک کو اس کا حق ملے، انسانیت کی حرمت وآبرو محفوظ رہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم درج بالا تاریخ کے اوراق میں محفوظ اپنے اسلاف کے کارناموں اور سعی وجہد کی پاسداری کریں گے۔ یہ کام مکتب اول یعنی ماؤں کی گود سے جاری وساری تعلیم پر منحصر ہے۔ اس کام کو ماہنامہ خواتین دنیا حتیٰ المقدور کررہا ہے تاکہ قوم کو تعلیم یافتہ اور مہذب و بیدار ماں نصیب ہو۔ گھر کے باہر بچوں کے اخلاق واوصاف گھریلو تربیت کی غمازی کرتے ہیں۔ اگر گھر کا ماحول شائستہ وسنجیدہ صداقت پر مبنی ہوگا تو یہ خوبیاں دہلیز کے باہر خوبصورت وخوشنما ماحول وفضا پیدا کریں گے ورنہ تعمیر کے بجائے تخریب ہوگی۔ گھر بذات خود ایک دنیا ہے اگر یہ دنیا شاد وآباد رہے گی تو باہر کی دنیا بھی پرلطف، پرمسرت ہوگی۔ گھر کو خوبصورت بنانا خواتین کی ذمہ داری ہے جبکہ تلاش معاش کا کام مردوں کے ذمے ہے۔ ہر مرد ایک پرسکون گھر چاہتا ہے اسی طرح ہر گھر ملک وقوم کا ایک اہم جزو ہوتا ہے جو کل کی صورت میں ملک بنتا ہے جس میں خواتین کا اہم کردار ہوتا ہے۔

آپ کا

شمس اقبال

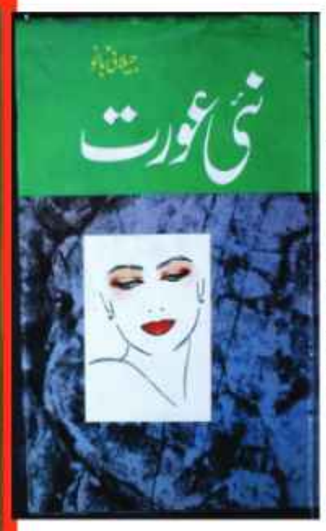

مفتی سہیل ندوی

جیلانی بانو کی ادبی و فکری وراثت کا تنقیدی جائزہ

اردو ادب کی تاریخ میں بعض نام ایسے ہوتے ہیں جو محض ایک فرد کی شناخت نہیں بلکہ ایک پورے عہد کی علامت بن جاتے ہیں۔ جیلانی بانو بھی انہی درخشاں ناموں میں شامل ہیں۔ یکم مارچ کو ان کے انتقال کی خبر نے ادبی دنیا کو سوگوار کر دیا۔ وہ صرف ایک افسانہ نگار نہیں تھیں بلکہ ایک عہد کی ترجمان، ایک تہذیبی شعور کی نمائندہ اور نسائی احساس کی باوقار آواز تھیں۔ ان کی رحلت نے اردو افسانے کے افق پر ایک خلا پیدا کیا ہے جو مدتوں محسوس کیا جائے گا۔

جیلانی بانو کا تعلق دکن کی علمی و تہذیبی سرزمین سے تھا، جہاں زبان کی شستگی، بیان کی لطافت اور فکر کی سنجیدگی ایک روایت کی صورت میں موجود ہے۔ اسی فضا میں ان کی ذہنی و فکری تربیت ہوئی۔ بچپن ہی سے مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ گھر کا ماحول ادبی تھا، جس نے ان کے اندر تخلیقی صلاحیتوں کو جِلا بخشی۔ نوجوانی کے ایام میں جب انھوں نے قلم اٹھایا تو ان کی تحریر میں ایک پختگی اور اعتماد جھلکتا تھا، جو کسی سنجیدہ ادیب کا خاصہ ہوتا ہے۔

ان کا ابتدائی ادبی سفر افسانہ نگاری سے شروع ہوا۔ اس دور میں اردو افسانہ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر تھا اور سماجی مسائل ادب کا مرکزی موضوع بن چکے تھے۔ جیلانی بانو نے اسی فضا میں اپنی آواز بلند کی، مگر ان کا انداز محض نعرہ بازی پر مبنی نہ تھا۔ انھوں نے انسانی نفسیات اور داخلی کرب کو موضوع بنایا۔ ان کے افسانوں میں عورت کا وجود محض مظلوم کردار کے طور پر نہیں بلکہ ایک باشعور، محسوس کرنے والی اور فیصلہ کرنے والی ہستی کے طور پر سامنے آتا ہے۔

ان کے افسانوی اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور معنویت ہے۔ وہ مشکل الفاظ یا پیچیدہ جملوں کے ذریعے اثر پیدا کرنے کی قائل نہیں تھیں۔ ان کی زبان رواں، شستہ اور دلنشین ہے۔ مگر اسی سادگی میں ایک گہری کاٹ اور اثر انگیزی موجود ہے۔ قاری جب ان کی کہانی پڑھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہی معاشرے کی کہانی سن رہا ہے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔

جیلانی بانو نے متوسط طبقے کی زندگی کو اپنے افسانوں کا خاص موضوع بنایا۔ ان کے ہاں گھر کی چار دیواری میں قید عورت کے خواب، اس کی محرومیاں، اس کی خاموش جدوجہد اور اس کی باطنی طاقت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ عورت کو صرف مظلوم کے طور پر پیش نہیں کرتیں بلکہ اس کے اندر موجود عزم اور وقار کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ یہی پہلو انھیں دیگر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔

ان کے افسانوں میں معاشرتی ناہمواری، طبقاتی فرق اور تہذیبی تبدیلی کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہ بدلتے ہوئے زمانے کی کشمکش کو بڑی باریکی سے محسوس کرتی تھیں۔ ان کے کردار جدیدیت اور روایت کے بیچ الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ نہ مکمل طور پر ماضی سے وابستہ ہیں اور نہ ہی اندھا دھند جدیدیت کو قبول کرتے ہیں۔

اس کشمکش کو جیلانی بانو نے نہایت متوازن انداز میں پیش کیا ہے۔

ادبی حلقوں میں ان کی پہچان تیزی سے مستحکم ہوئی۔ رسائل و جرائد میں ان کے افسانے شائع ہونے لگے اور نقادوں نے ان کی تحریر کو سنجیدگی سے لینا شروع کیا۔ انھوں نے ثابت کیا کہ عورت بھی فکری اور تخلیقی میدان میں کسی سے کم نہیں۔ ان کی کامیابی نئی نسل کی خواتین کے لیے حوصلہ افزا مثال بنی۔

جیلانی بانو کی شخصیت وقار اور سادگی کا حسین امتزاج تھا۔ وہ شہر کے باوجود انکساری کی پیکر رہیں۔ ادبی محفلوں میں ان کی گفتگو کم مگر بامعنی ہوتی تھی۔ نوجوان لکھنے والوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی ان کا خاص وصف تھا۔ وہ ادب کو معاشرتی ذمے داری سمجھتی تھیں اور قلم کو ایک امانت تصور کرتی تھیں۔

جیلانی بانو کے افسانوی مجموعے اور ناول کا فنی وفکری تجزیہ

جیلانی بانو کا ادبی سفر محض چند کہانیوں تک محدود نہیں رہا بلکہ انھوں نے افسانے اور ناول دونوں میدانوں میں اپنی گہری چھاپ چھوڑی۔ ان کے افسانوی مجموعے اردو ادب میں ایک معتبر مقام رکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں داخلی احساس، سماجی شعور اور تہذیبی آگہی کا جو امتزاج ملتا ہے، وہ انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔

ان کے افسانوی مجموعوں میں عورت کی نفسیاتی کیفیات کو نہایت باریکی سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ عورت کو محض مظلوم کردار کے طور پر پیش نہیں کرتیں بلکہ اسے ایک مکمل انسان کے طور پر دیکھتی ہیں، جو سوچتی ہے، فیصلہ کرتی ہے اور حالات سے نبرد آزما ہوتی ہے۔ ان کی کہانیوں میں نسائی شعور ایک خاموش مگر مضبوط لہجے میں ابھرتا ہے۔ وہ جذباتی نعرہ بازی کے بجائے عملی حقیقتوں کی تصویر کشی کرتی ہیں۔

جیلانی بانو کی تحریروں میں متوسط طبقے کی زندگی کا گہرا مشاہدہ ملتا ہے۔ گھریلو مسائل، معاشی دباؤ، رشتوں کی پیچیدگیاں اور تہذیبی تبدیلی کے اثرات ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہیں۔ ان کی کہانیوں میں قاری کو ایک داخلی سکوت اور فکری سنجیدگی محسوس ہوتی ہے۔

ناول نگاری کے میدان میں بھی انھوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ان کے ناولوں میں پلاٹ کے ساتھ ساتھ کرداروں کی نفسیاتی تشکیل پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ وہ واقعاتی تسلسل سے زیادہ کردار کی باطنی دنیا کو اہمیت دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول محض کہانی نہیں بلکہ ایک عہد کا سماجی اور فکری مطالعہ محسوس ہوتے ہیں۔

ان کے ناولوں میں تہذیبی زوال، سماجی ناہمواری اور انسانی اقدار کی شکست و ریخت کو گہرے احساس کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ ماضی کی روایات اور حال کی تبدیلیوں کے درمیان کشمکش کو اجاگر کرتی ہیں۔

فنی اعتبار سے جیلانی بانو کا اسلوب نہایت متوازن ہے۔ وہ علامت اور استعارے کا استعمال بھی کرتی ہیں مگر اس حد تک کہ معنی میں گہرائی پیدا ہو، نہ کہ ابہام۔ ان کی زبان شستہ، رواں اور تہذیبی رنگ لیے ہوئے ہے۔ مکالمہ مختصر مگر مؤثر ہوتا ہے اور منظر نگاری میں اعتدال پایا جاتا ہے۔

تنقیدی حلقوں میں ان کے کام کو سنجیدگی سے لیا گیا۔ نقادوں نے اس بات کی نشاندہی کی کہ انھوں نے اردو افسانے میں نسائی تجربے کو ایک باوقار اور فکری انداز میں پیش کیا۔ ان کے ہاں احتجاج بھی ہے مگر تہذیب کے دائرے میں۔ یہی اعتدال ان کی تحریر کو دیرپا بناتا ہے۔

جیلانی بانو کے افسانوں میں امید کی ایک مدھم مگر مسلسل روشنی موجود رہتی ہے۔ وہ معاشرتی مسائل کو بیان کرتے ہوئے مکمل مایوسی پیدا نہیں کرتیں۔ ان کے کردار ٹوٹتے ہیں مگر بکھرتے نہیں۔ یہی انسانی وقار ان کی تخلیقات کا بنیادی پیغام ہے۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں مختلف اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا۔

جیلانی بانو نے یہ ثابت کیا کہ ادب معاشرے کا آئینہ بھی ہے اور اس کی اصلاح کا ذریعہ بھی۔ انھوں نے عورت کی داخلی دنیا کو اس وقار کے ساتھ پیش کیا کہ اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔

جیلانی بانو کی شخصیت، نجی زندگی اور سماجی اثرات

جیلانی بانو کی شخصیت ان کی تحریروں کی طرح متوازن، باوقار

اور گہرے شعور کی آئینہ دار تھی۔ وہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود نہایت سادہ مزاج اور منکسر تھیں۔ ان کی نجی زندگی میں بھی وہی سنجیدگی اور وقار جھلکتا تھا جو ان کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ وہ گفتگو میں شائستگی، رویّے میں تحمل اور فکر میں اعتدال کی قائل تھیں۔ یہی اوصاف انھیں محض ایک ادیبہ نہیں بلکہ ایک قابلِ احترام شخصیت بناتے ہیں۔

ان کی نجی زندگی خاندانی ذمہ داریوں اور ادبی مصروفیات کے درمیان توازن کی بہترین مثال تھی۔ انھوں نے گھریلو زندگی کو نظر انداز کیے بغیر تخلیقی سفر جاری رکھا۔ یہ امر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ محنت، نظم و ضبط اور عزم کی پیکر تھیں۔ انھوں نے عملی طور پر یہ ثابت کیا کہ عورت اگر حوصلہ اور استقلال رکھے تو گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی میدان میں بھی نمایاں مقام حاصل کرسکتی ہے۔

جیلانی بانو کا سماجی شعور نہایت بیدار تھا۔ وہ معاشرتی مسائل کو صرف موضوع کے طور پر نہیں بلکہ ذاتی احساس کے طور پر محسوس کرتی تھیں۔ ان کے افسانوں میں جو درد اور سچائی ملتی ہے، وہ دراصل ان کے مشاہدے اور تجربے کا نتیجہ ہے۔ وہ سماج میں پائی جانے والی ناانصافی، طبقاتی فرق اور صنفی امتیاز کے خلاف خاموش مگر مضبوط آواز تھیں۔ ان کا احتجاج شور و غوغا سے پاک مگر معنویت سے بھرپور تھا۔

ادبی محفلوں اور مذاکروں میں ان کی شرکت محدود مگر مؤثر ہوتی تھی۔ وہ غیر ضروری نمود و نمائش سے گریز کرتی تھیں۔ ان کی گفتگو مدلل اور متوازن ہوتی تھی۔ نوجوان قلم کار ان سے رہنمائی حاصل کرتے اور وہ فراخ دلی سے ان کی حوصلہ افزائی کرتیں۔ انھوں نے کبھی ادبی حسد یا رقابت کو اپنے مزاج کا حصہ نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ مثبت طرزِ فکر کو فروغ دیا۔

ان کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو تہذیبی شعور تھا۔ وہ دکن کی تہذیب، زبان کی لطافت اور معاشرتی اقدار سے گہری وابستگی رکھتی تھیں۔ ان کی تحریروں میں دکنی ماحول کی جھلک نمایاں ہے۔ اس طرح انھوں نے نہ صرف ادب کی خدمت کی بلکہ تہذیبی ورثے کو بھی محفوظ کیا۔ ان کا کام آنے والی نسلوں کے لیے ایک ثقافتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

جیلانی بانو کی زندگی جدوجہد سے خالی نہیں تھی۔ انھوں نے ادبی میدان میں اپنی جگہ بنانے کے لیے مسلسل محنت کی۔ اس دور میں جب خواتین قلم کاروں کے لیے مواقع محدود تھے، انھوں نے اپنی صلاحیتوں کے بل پر شناخت قائم کی۔ ان کی کامیابی نے بہت سی خواتین کو قلم اٹھانے کا حوصلہ دیا۔ اس اعتبار سے وہ ایک تحریک کا درجہ رکھتی ہیں۔

تنقیدی طور پر دیکھا جائے تو جیلانی بانو نے اردو ادب میں نسائی شعور کو ایک وقار اور سنجیدگی عطا کی۔ انھوں نے عورت کو محض جذباتی استعارہ نہیں بنایا بلکہ اسے ایک باشعور اور فعال کردار کے طور پر پیش کیا۔ یہی پہلو انھیں اردو ادب کی تاریخ میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔

ادبی مقام، تنقیدی جائزہ اور مجموعی اثرات

جیلانی بانو کا ادبی مقام اردو افسانے کی تاریخ میں نہایت اہم اور مستحکم ہے۔ وہ اُن قلم کاروں میں شمار ہوتی ہیں جنھوں نے محض کہانیاں نہیں لکھیں بلکہ عہد کی روح کو لفظوں میں ڈھالا۔ ان کی تخلیقات میں داخلی کرب، معاشرتی شعور اور تہذیبی آگہی کا جو امتزاج ملتا ہے، وہ انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کا نام اردو افسانہ نگاری کے سنجیدہ اور باوقار دبستان میں احترام سے لیا جاتا ہے۔

تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جیلانی بانو نے اردو ادب میں نسائی شعور کو ایک نئی سمت دی۔ انھوں نے عورت کے تجربے کو نہ تو محض جذباتی سطح پر پیش کیا اور نہ ہی اسے نعرہ بازی کا ذریعہ بنایا۔ ان کے ہاں عورت ایک سوچنے سمجھنے والی، داخلی کشمکش سے گزرنے والی اور حالات کا مقابلہ کرنے والی شخصیت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ یہی اعتدال اور فکری سنجیدگی ان کی تحریر کو پائیداری عطا کرتی ہے۔

ان کی فنی خصوصیات میں سب سے نمایاں وصف سادگیِ بیان

اور معنوی گہرائی ہے۔ وہ زبان کو بوجھل نہیں بناتیں بلکہ سہل اسلوب میں گہری بات کہہ جاتی ہیں۔ ان کے مکالمے مختصر مگر مؤثر ہوتے ہیں اور کرداروں کی نفسیاتی تشکیل نہایت باریک بینی سے کی گئی ہے۔ انھوں نے علامت اور استعارے کا استعمال بھی کیا، مگر اس حد تک کہ معنی میں وسعت پیدا ہو، نہ کہ ابہام۔

جیلانی بانو کی تحریروں میں دکن کی تہذیب اور معاشرتی رنگ نمایاں ہیں۔ اس طرح ان کا ادب محض تخلیقی اظہار نہیں بلکہ ایک تہذیبی دستاویز بھی ہے۔ انھوں نے بدلتے ہوئے سماجی ڈھانچے اور انسانی رشتوں کی پیچیدگی کو بڑی مہارت سے پیش کیا۔ ان کے افسانے اور ناول اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کے مسائل سے پوری طرح باخبر تھیں۔

جیلانی بانو کی تحریروں میں دکن کی تہذیب اور معاشرتی رنگ نمایاں ہیں۔ اس طرح ان کا ادب محض تخلیقی اظہار نہیں بلکہ ایک تہذیبی دستاویز بھی ہے۔ انھوں نے بدلتے ہوئے سماجی ڈھانچے اور انسانی رشتوں کی پیچیدگی کو بڑی مہارت سے پیش کیا۔ ان کے افسانے اور ناول اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کے مسائل سے پوری طرح باخبر تھیں۔

ان کی خدمات کا ایک اہم پہلو نئی نسل پر ان کا اثر ہے۔ متعدد نوجوان قلم کاروں نے ان سے رہنمائی حاصل کی اور ان کے اسلوب سے متاثر ہوئے۔ جامعات میں ان کے فن پر تحقیقی مقالے لکھے گئے اور ان کی تخلیقات کو نصاب کا حصہ بنایا گیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کا ادبی سرمایہ وقتی نہیں بلکہ علمی اہمیت کا حامل ہے۔

جیلانی بانو کا عہد، ادبی تحریکیں اور فکری پس منظر

جیلانی بانو کو سمجھنے کے لیے صرف ان کی تحریروں کا مطالعہ کافی نہیں، بلکہ اس عہد کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جس میں انھوں نے قلم اٹھایا۔ وہ ایسے زمانے میں منظرِ عام پر آئیں جب اردو ادب ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور بعد جدیدیت کے مباحث سے گزر رہا تھا۔ سماجی انصاف، طبقاتی کشمکش، عورت کی آزادی اور فرد کی داخلی تنہائی جیسے موضوعات ادبی گفتگو کا حصہ بن چکے تھے۔ جیلانی بانو نے ان تمام فکری رجحانات سے آگاہ رہتے ہوئے اپنی راہ متعین کی۔ وہ کسی مخصوص ادبی گروہ یا نظریاتی دائرے میں محدود نہیں ہوئیں، بلکہ اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر اظہار کرتی رہیں۔

ان کے ہاں ترقی پسند فکر کی جھلک ضرور ملتی ہے، خاص طور پر سماجی ناہمواری اور طبقاتی فرق کے بیان میں، مگر ان کی تحریر محض نظریاتی وابستگی تک محدود نہیں۔ وہ فرد کے داخلی احساس اور نفسیاتی پیچیدگی کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتی ہیں۔ اس طرح انھوں نے خارجی حقیقت اور داخلی شعور کے درمیان ایک متوازن رشتہ قائم کیا۔ یہی توازن ان کی فنی پختگی کا ثبوت ہے۔

دکن کی تہذیب اور ماحول نے بھی ان کی فکر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ حیدرآباد اور اس کے گرد و نواح کی ثقافتی فضا، زبان کی مٹھاس، اور خاندانی نظام کی پیچیدگیاں ان کے افسانوں میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ وہ مقامی رنگ کو اس مہارت سے برتتی ہیں کہ وہ آفاقی معنویت اختیار کر لیتا ہے۔ یوں ان کا ادب علاقائی ہونے کے باوجود عالمی انسانی تجربے سے جڑ جاتا ہے۔

اسلوب، تکنیک اور فنی امتیازات

جیلانی بانو کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت سادگی اور سلاست ہے۔ وہ غیر ضروری پیچیدگی سے گریز کرتی ہیں۔ ان کے جملے رواں اور بامعنی ہوتے ہیں۔ وہ قاری کو الجھانے کے بجائے سوچنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں بیانیہ تسلسل برقرار رہتا ہے اور واقعات فطری انداز میں آگے بڑھتے ہیں۔

کردار نگاری ان کے فن کا بنیادی ستون ہے۔ وہ کردار کے باطن میں اتر کر اس کی نفسیاتی کیفیت کو اجاگر کرتی ہیں۔ ان کے کردار سفید و سیاہ کی تقسیم میں نہیں بٹے ہوتے بلکہ انسانی کمزوریوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ یہی حقیقت نگاری ان کی تحریر کو

زندگی سے قریب تر بناتی ہے۔

علامت اور استعارہ بھی ان کے ہاں ملتے ہیں، مگر وہ محض فنی نمائش کے لیے نہیں بلکہ معنی کی تہہ داری پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کی منظر نگاری میں اعتدال ہے؛ وہ ماحول کو اس طرح بیان کرتی ہیں کہ فضا قائم ہو جائے، مگر تفصیل اس حد تک نہیں بڑھتیں کہ کہانی کی روانی متاثر ہو۔

نسائی شعور اور انسانی ہمدردی

جیلانی بانو کو اکثر نسائی ادب کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے، مگر ان کا دائرہ اس سے کہیں وسیع ہے۔ انھوں نے عورت کے مسائل کو ضرور بیان کیا، مگر انھیں محض عورت تک محدود نہیں رکھا۔ ان کے ہاں انسان بنیادی قدر ہے۔ عورت ہو یا مرد، بچہ ہو یا بزرگ ہر کردار اپنی داخلی سچائی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

انھوں نے عورت کے دکھ کو بیان کرتے ہوئے اس کے وقار کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ ان کے افسانوں میں عورت ایک باوقار اور خوددار شخصیت کے طور پر ابھرتی ہے۔ وہ ظلم سہتی ہے مگر اندر سے ٹوٹتی نہیں۔ یہی باطنی قوت ان کی تحریر کا مرکزی پیغام ہے۔

ساتھ ہی انھوں نے مرد کرداروں کو بھی یک رخا انداز میں پیش نہیں کیا۔ وہ مرد کی کمزوریوں اور الجھنوں کو بھی سمجھتی ہیں۔ اس طرح ان کا ادب صنفی تقسیم سے اوپر اٹھ کر انسانی ہمدردی کی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔

جیلانی بانو کی زندگی اور فن اس حقیقت کا اعلان ہے کہ سچا ادب وقت کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ ایک باوقار، سنجیدہ اور بااثر ادیبہ کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔

منتخب افسانوں کا تنقیدی مطالعہ داخلی کرب اور سماجی شعور

جیلانی بانو کے افسانوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے ہاں کہانی محض واقعاتی ترتیب نہیں بلکہ ایک داخلی تجربہ ہے۔ ان کے کئی معروف افسانوں میں عورت کی خاموش جدوجہد، معاشرتی جبر اور داخلی اضطراب کو نہایت باریکی سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ کردار کو اس کے ماحول سے کاٹ کر نہیں دیکھتیں بلکہ سماجی پس منظر کے ساتھ مربوط کرتی ہیں۔ اس طرح ان کی کہانی ایک فرد کی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی کہانی بن جاتی ہے۔

ان کے ایک نمایاں افسانے میں متوسط طبقے کی گھریلو عورت کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے، جو بظاہر ایک معمولی سی ہستی ہے مگر اس کے اندر احساسات کا ایک طوفان موجزن ہے۔ جیلانی بانو اس کردار کی خاموشی میں پوشیدہ احتجاج کو نمایاں کرتی ہیں۔ وہ چیخ و پکار کے بجائے سکوت کے ذریعے مزاحمت کا تاثر پیدا کرتی ہیں۔ یہی فنی مہارت ان کے اسلوب کو منفرد بناتی ہے۔

ان کے کئی افسانوں میں بچپن کی معصومیت اور سماجی حقیقت کے تصادم کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں میں ایک خاص قسم کی سچائی اور شفافیت ملتی ہے۔ وہ دکھ کو اس انداز میں بیان کرتی ہیں کہ قاری کے دل پر اثر ہوتا ہے مگر تحریر جذباتیت میں مبتلا نہیں ہوتی۔

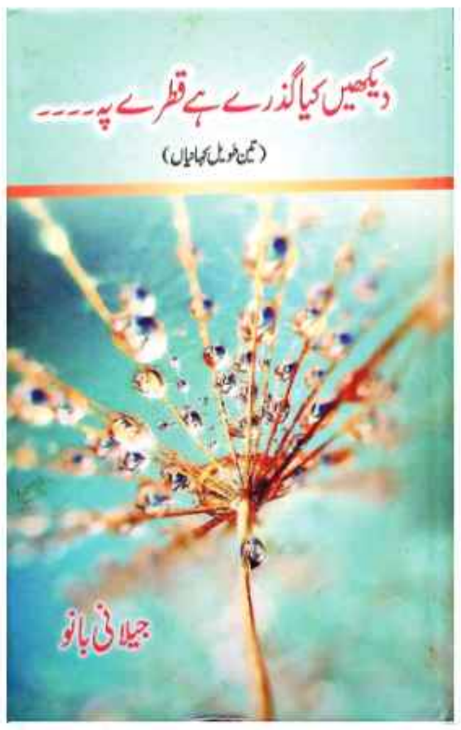

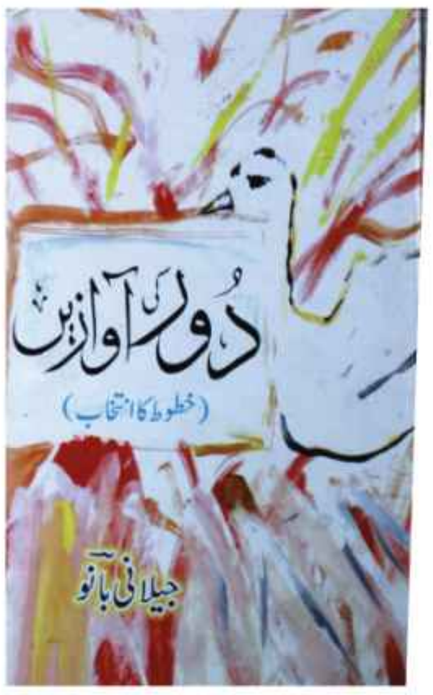

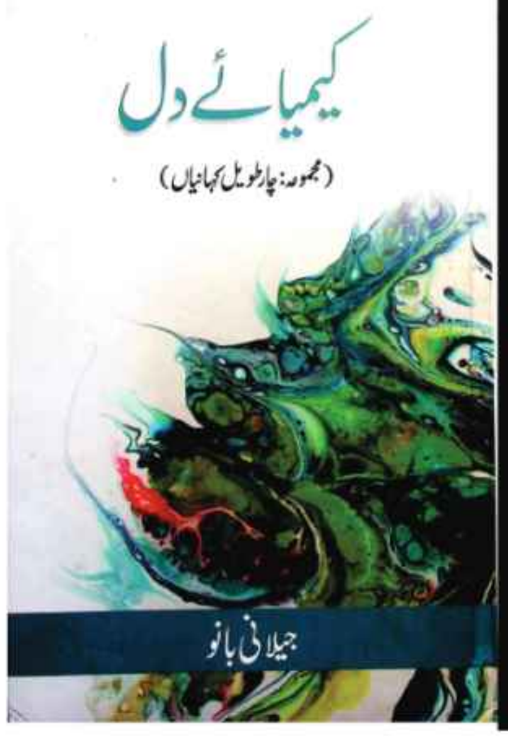

ناولوں کا فکری وسماجی تناظر

جیلانی بانو کے ناول ان کے افسانوں کی توسیع معلوم ہوتے ہیں، مگر فنی اعتبار سے زیادہ وسیع اور گہرے ہیں۔ ناول میں انھیں کرداروں کی نفسیاتی تشکیل اور معاشرتی پس منظر کو زیادہ تفصیل سے پیش کرنے کا موقع ملا۔ ان کے ناولوں میں تہذیبی زوال، طبقاتی تقسیم اور بدلتی ہوئی اقدار کا عکس ملتا ہے۔

وہ ناول میں پلاٹ کے روایتی اتار چڑھاؤ کے بجائے داخلی ارتقا کو اہمیت دیتی ہیں۔ ان کے کردار وقت کے ساتھ بدلتے ہیں، ان کے خیالات اور رویّے ارتقا پذیر ہوتے ہیں۔ یہی نفسیاتی گہرائی ان کے ناولوں کو محض کہانی سے آگے بڑھا کر ایک فکری دستاویز بنا دیتی ہے۔

ان کے ناولوں میں عورت کی شناخت کا سوال بار بار ابھرتا ہے۔ مگر وہ اس سوال کو تصادم کی صورت میں پیش کرنے کے بجائے شعوری بیداری کے انداز میں بیان کرتی ہیں۔ ان کے کردار آہستہ آہستہ اپنی ذات کو پہچانتے ہیں اور اپنی خاموش طاقت کو دریافت کرتے ہیں۔

ادبی تنظیموں نے انھیں مختلف اعزازات سے نوازا۔ مگر ان کی اصل کامیابی قارئین کی محبت اور اعتماد تھا۔ ان کے افسانے بار بار شائع ہوئے اور نئی نسل نے بھی انھیں شوق سے پڑھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا ادب وقتی رجحان نہیں بلکہ دیرپا اہمیت رکھتا ہے۔

مجموعی جائزہ اور فکری میراث

جیلانی بانو کی مجموعی ادبی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو ادب میں ایک باوقار اور سنجیدہ روایت کو مضبوط کیا۔ انھوں نے نہ صرف عورت کے داخلی احساس کو آواز دی بلکہ انسانی ہمدردی اور سماجی انصاف کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ ان کی تحریر میں احتجاج ہے مگر تہذیب کے ساتھ، درد ہے مگر وقار کے ساتھ، اور امید ہے مگر حقیقت پسندی کے ساتھ۔

ان کی وفات یکم مارچ کو ہوئی، مگر ان کا فکری اور ادبی ورثہ زندہ ہے۔ ان کے افسانے اور ناول آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دیتے رہیں گے کہ سچا ادب وہ ہے جو انسان کے باطن کو چھو لے اور اسے سوچنے پر مجبور کرے۔

جیلانی بانو اردو ادب کی تاریخ میں ایک روشن اور باوقار نام کے طور پر ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ان کی خدمات کو محفوظ رکھنا اور نئی نسل تک پہنچانا ہم سب کی ادبی ذمے داری ہے۔

مجموعی طور پر جیلانی بانو کی زندگی اور خدمات اس حقیقت کی مظہر ہیں کہ ادب معاشرے کا آئینہ بھی ہے اور اس کی اصلاح کا ذریعہ بھی۔ انھوں نے قلم کو ذمہ داری سمجھ کر استعمال کیا اور انسانی وقار، انصاف اور ہمدردی کا پیغام عام کیا۔ ان کی تحریریں آنے والی نسلوں کو یہ درس دیتی رہیں گی کہ تخلیق کار کا اصل سرمایہ اس کی سچائی اور خلوص ہے۔ اردو ادب انھیں ہمیشہ احترام، محبت اور قدر کے ساتھ یاد رکھے گا۔

حوالہ جات

1 بانو، جیلانی۔ ایوانِ غزل۔ حیدرآباد: مطبوعاتِ جدید۔

2 بانو، جیلانی۔ بارشِ سنگ۔ نئی دہلی: مکتبہ جامعہ۔

3 بانو، جیلانی۔ مختلف افسانوی مجموعے۔

4 فاروقی، شمس الرحمن۔ اردو افسانے کی تنقید۔ الٰہ آباد: شب خون کتاب گھر۔

5 نارنگ، گوپی چند۔ اردو ادب میں جدیدیت۔ نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی۔

6 سدید، انور۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز۔

7 اختر، سلیم۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔ لاہور: کتاب سرائے۔

8 شیریں، ممتاز۔ اردو افسانے کی تنقید۔ کراچی: مکتبہ اسلوب۔

9 وزیر آغا۔ تنقیدی مضامین۔ لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب۔

10 انسائیکلوپیڈیا اردو ادب۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی۔

11 قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (NCPUL)۔ اردو ادب کے ممتاز ادبا۔ نئی دہلی۔

❐❐❐

Dr. Mufti Sohail Nadwi
Former Principal– MESCO College, Hyderabad
Head, Department of Urdu
Hyderabad Institute of Excellence,
Vikarabad Telangana-501101(T.S)
msanadvi93900@gmail.com

اسلم جمشید پوری

مسرور جہاں مسرور
سے
اسلم جمشید پوری کی گفتگو

'ناول یا افسانے کے لیے زبان و بیان کا ہونا ضروری 'مسرور جہاں

اردو فکشن کا معتبر اور مستحکم نام مسرور جہاں ہے جنھوں نے اپنی تحریروں سے اردو ناول اور افسانے کی دنیا میں میں اپنی شناخت مستحکم کی۔انھوں اپنے دلچسپ اندازِ تحریر سے قارئین کا دل جیت لیا۔خاص کر اردو کی خواتین فکشن نگاروں میں آپ کا شمار صفِ اول میں ہوتا ہے۔آپ کے ناول اور افسانے کا لوگ بے صبری سے انتظار کرتے اور دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ایک زمانہ تھا جب ان کا ادب میں طوطی بولتا تھا۔کیا ہندوستان کیا پاکستان ، ہر طرف ان کی تحریریں ہوتی تھیں۔ناول اور افسانے سے وہ ادب پر چھائی ہوئی تھیں۔ نیا موضوع اور نرالا انداز انھیں مقبول بناتا گیا۔ان کے ناول 'نئی بستی، گردشیں، نئی امنگیں ، فیصلہ، روبینہ، آواز نہ دو، دھوپ چھاؤں، سمندر، سیپ اور ساحل ، راستے اور منزلیں، اور ان کے افسانے 'کنجی، واپسی، بند دروازہ، ٹکڑوں میں بٹی عورت، بند گلی کا آخری مکان، قد آور بونے، کہاں ہو تم، شال فروش، لٹیرا، جلا وطن، پل صراط، تیرے میرے دکھ، نے کافی شہرت پائی اور ان کی شناخت بنے ۔اتر پردیش اردو اکادمی کا فکشن ایوارڈ، وقارِ اودھ، ایس زوار حسین عابدی ایوارڈ اور مختلف کتب پر کئی اردو اکادمیوں نے انھیں ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ان پر کئی یونیورسٹیز اور کالج میں تحقیقی مقالے لکھے گئے ۔خاص کر یونیورسٹی آف تاجکستان میں ان پر پی ایچ ۔ڈی کا مقالہ تحریر ہوا۔کئی رسالوں نے گوشے شائع کیے خصوصاً 'چہار سو' (پاکستان) ۔انھوں نے دوردرشن کے ایک سیریل 'صلیب پہ ٹنگی زندگی' (2013) میں تحریر کیا۔

اردو اکادمی کی میٹنگوں کے سلسلے میں میرا لکھنو آنا جانا بڑھ گیا تھا۔ہر دورے میں میری خواہش ہوتی کہ میں لکھنو کے بڑے ادبا و شعرا سے ملوں۔مسرور جہاں سے بھی ملنے کا مجھے بڑا اشتیاق تھا۔ان سے ملاقات ہوئی ۔ان کی شخصیت میں وہ جادو تھا کہ سر چڑھ کر بولنے لگا۔وہ بہت بے باک تھیں ،ان کا لہجہ بارعب تھا۔ان کی آواز میں بلا کا جادو تھا۔میں بارہا ان کے پاس گیا۔ان سے ایک تعلق خاص بن گیا تھا۔ایک دن میں نے ان سے گفتگو کی ۔میرے ہمراہ لکھنو یونیورسٹی کے فیروز تھے جو شاید بی اے کے طالب علم تھے۔ انھوں نے اپنے موبائل سے ہم دونوں کی تصویریں لیں۔انھوں نے اپنی بیٹی صبوحی سے ملوایا۔فکشن کا یہ سورج ،22 ستمبر 2019 میں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔یہ کچا پکا انٹرویو میرے پاس رکھا تھا۔ان کے انتقال کے چھ سال بعد میں نے اسے ،ان کی بیٹی صبوحی پروین کی مدد سے پورا کیا۔مسرور جہاں سے گفتگو تو خاصی

طویل تھی۔آپ کے لیے گفتگو کی اہم باتیں حاضر ہیں۔

ا۔ج :آپ کی پیدائش کب ہوئی۔؟ آپ نے تعلیم کہاں پائی اورآپ کا پہلا افسانہ کون سا تھا۔؟

م۔ج : میری پیدائش 8 جولائی 1938 میں، بارہ بنکی ضلع کے فتح پور میں ہوئی ۔میری عمر ابھی کوئی چودہ سال تھی،شاید 1952 کی بات ہے،جب میرا پہلا افسانہ ''وہ کون تھی ؟'' قومی آواز کے لکھنؤ ایڈیشن میں شائع ہوا۔یہ میرے لیے بہت بڑا دن تھا۔میں بہت خوش تھی ۔ میری تعلیم لکھنو ہی میں ہوئی ۔پہلے گھر پر ابتدائی تعلیم ہوئی۔پھر میں نے کشمیری گرلز انٹر کالج سے تعلیم حاصل کی۔

ا۔ج :ادب کا ذوق کہاں سے ملا؟ گھر اور آس پاس کا ماحول کیسا تھا۔؟

م۔ج : گھر کا ماحول اچھا خاصا ادبی تھا۔ادبی رسائل گھر آتے تھے۔والد صاحب،نصیر حسین خیال اپنے زمانے کے لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے۔ان کا کلام کئی کالجز کے نصاب میں شامل ہے۔والدہ شوکت بیگم اچھا ادبی ذوق رکھتی تھیں۔نانی مصطفیٰ بیگم ذاکرہ تھیں۔بڑی بڑی محفلوں میں ذکر کرتیں۔اسلامیہ کالج کے ایک مشاعرے میں والد صاحب نے بھی کلام سنایا تھا۔انھوں نے محفل کو لوٹ لیا تھا۔مجھے ایک مصرعہ ابھی تک یاد ہے۔

'خیال ایک حسرت بھی نہ نکلی دل کی'

میرے چھوٹے بھائی وقار ناصری کامیاب شاعر،ادیب ، ترجمہ نگار اور ناقد تھے۔دریچے،قضا کے دنوں میں محبت (ناول) پیش خیمہ (شعری مجموعہ) شہرِ میر اور ناصر کاظمی،قرۃ العین حیدر۔ ایک ذہنی جلاوطن (تنقیدی مضامین) شہر میں کرفیو (ناول۔وی این رائے،ترجمہ) ان کی خاص کتابیں ہیں۔ہمارے ایک پروفیسر تھے شیخ مہدی حسین ناصر لکھنوی۔وہ سات زبانوں کے ماہر تھے۔ان کے علم کا کیا ٹھکانہ۔کسی بھی موضوع پر بے تکان بولتے۔علامہ اثر لکھنوی کے معاصر تھے۔انھوں نے اپنی قبر کے کتبے پر لکھوایا تھا۔

'طول کھینچی ہے یہاں تک شبِ تنہائی نے'

افسانے اور ناول لکھنے کا شوق خداداد ہے۔مجھے یاد ہے جب میں بہت چھوٹی تھی ،شاید ساتویں یا آٹھویں میں ،تب میرا پہلا افسانہ ''وہ کون تھی؟'' شائع ہوا تھا۔بس پھر کیا تھا،میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔افسانے پر افسانے لکھے ،ناول بھی تحریر کئے ۔اس زمانے میں مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔اسی دور میں، میں نے راشد الخیری ، ،پریم چند، ،عصمت چغتائی ،صالحہ عابد حسین ،صادق سردھنوی ،رئیس جعفری ،قرۃ العین حیدر،اسلم جیراجپوری وغیرہ کے بے شمار ناول پڑھے ۔ناول لکھنے کے جذبے نے سر ابھارا اور میں لکھتی چلی گئی۔

ا۔ج : سنا ہے آپ فرضی ناموں سے بھی لکھتی رہی ہیں۔؟

م۔ج : (مسکراتے ہوئے) جی ۔۔آپ نے صحیح سنا۔ڈرتے تھے کہ کہیں تحریر میں ایسی ویسی کوئی بات نہ ہو۔لہٰذا کئی ناموں سے لکھا۔نازاں روحی ،لتا پروین،مسرور خیال ،بعد میں مسرور جہاں کے نام سے لکھا۔1960 میں مسرور خیال کے نام سے تو میرا ایک ناول 'فیصلہ' بھی شائع ہوا ۔پھر میں 1962 سے مسرور جہاں ہو گئی۔آپ کو حیرانی ہو گی کہ یہی میرا اصل نام تھا۔1964 میں میرا دوسرا ناول 'روبینہ' شائع ہوا۔تب سے میں مسرور جہاں ہی ہوں۔

ا۔ج : سنا ہے آپ نے زندگی میں بڑی جدوجہد کی۔حالات کا دلیری سے مقابلہ کیا۔کبھی امید کا دامن نہیں چھوڑا۔آپ کتنے بھائی بہن تھے۔؟ آپ کی شادی کب اور کس سے ہوئی ۔؟ آپ کے کتنے بچے ہیں۔؟

م۔ج : ارے ارے! آپ نے تو سوالوں کی بوچھار کر دی۔ ایک ایک کر کے۔میں کوشش کرتی ہوں کہ آپ کے ایک ایک سوال کا جواب دوں۔مت پوچھئے میں نے بڑے سخت حالات کا سامنا کیا۔مگر کبھی ہار نہیں مانی ۔ہم لوگ آٹھ بہن بھائی تھے ۔چار بہنیں اور چار بھائی (تنویر حسین ،توقیر حسین [وقار ناصری]،اختر حسین، سرتاج عالم،نزہت جہاں،نصرت جہاں،مہتاب جہاں) ۔بچپن میں بڑا مزہ آتا تھا۔ہم بہنیں مل کر کھیلتے ۔کبھی کبھار بھائی بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جاتے ۔خوب اودھم مچاتے ۔ایک دوسرے کو مارتے۔کھیلوں میں چکمہ دیتے ۔آنکھ مچولی کھیلتے۔کھیل کھیل میں

کب بڑی ہوگئی پتہ ہی نہیں چلا۔ جب میری شادی طے ہوئی تو علم ہوا۔ یہ شاید 1955 کا زمانہ تھا۔اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میری شادی عمر میں مجھ سے بہت بڑے ایک شادی شدہ شخص،نواب سید محمد مرتضٰی علی خاں (ولدنواب سید علی خاں) سے ہورہی تھی۔

ان میں نوابی آن بان تھی ۔ان کی بیٹیاں میرے برابر ہورہی تھیں۔نواب مرتضٰی صاحب مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔میرا بہت خیال رکھتے ۔لوگ مجھے نواب بیگم کہا کرتے۔ان کی بیٹیاں، جو میری بھی سوتیلی بیٹیاں تھیں ،مجھ سے دور دور رہتیں اور بعض معاملات میں مجھ سے تقابل کرتیں۔ پریشان کرتیں۔میری محبتیں اور قربانیاں رائگاں تھیں۔آخر کو میں ایک سوتیلی ماں تھی ۔یہ الگ بات ہے کہ میں نے اپنے شوہر کے بچوں کو کبھی سوتیلا نہیں سمجھا۔انھیں حتی الامکان پیار دیا۔

ا۔ ج: اپنی ازدواجی زندگی اور اپنی سسرال کے بارے میں کچھ اور بتائیں۔

م۔ ج : بہت ہنسی خوشی گزر رہی تھی ۔جب انھوں نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دیا تو پھر انھوں نے میرے گھر رشتہ بھجوایا جسے ہمارے دادا نے منع کردیا۔ انھوں نے چار بار رشتہ بھجوایا، جو منع ہو گیا۔ پانچویں بار میں، امی نے مداخلت کی اور رشتہ قبول کرلیا گیا۔ شادی ہوگئی ۔یہ چھوٹے نواب کہلاتے تھے ۔مگر نوابی دور چلا گیا تھا۔مگر وہ جو مثل ہے نا۔ ''رسّی جل گئے لیکن بل نہیں گئے ۔'' اسی کے مصداق ہر بات کا خیال رکھا جاتا۔ان کے اندر خودداری بہت تھی ۔ایک بار والد صاحب سے سگریٹ کے پیسے مانگے ،تو انھوں نے یہ کہہ کر منع کردیا کہ میں تمھاری ہر ضرورت پوری کروں گا مگر میرے پاس تمھارے شوق کے لیے پیسہ نہیں ہے ۔یہ بات ان کے دل پر لگی ۔اس دن کے بعد انھوں نے اپنے والد سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔خود کمایا اور خوب کمایا۔ جائیدادیں بنائیں۔کوٹھیاں تعمیر کیں۔والد صاحب سے کبھی کوئی پیسہ یا جائیداد نہیں لی ۔مجھے اور میرے بچوں کو ہر طرح کا عیش دیا۔اچھے سے اچھے اسکول میں پڑھایا۔خوب کمایا مگر لٹایا نہیں۔ بلکہ وہ پیسے کو دانت سے پکڑتے تھے۔پہلی بیوی سے ان کے تین اولادیں تھیں۔ عالم نواب،روشن جہاں بیگم اور قمر جہاں بیگم ۔ان کا بیٹا مجھے بہت مانتا تھا جبکہ ان کی بیٹیاں میرے پیچھے پڑی رہتیں۔ میں نے کسی طرح وقت کاٹا۔

1956 میں، میں ماں بنی۔میری بیٹی (روحی نسرین) ہوئی تھی۔ اگلے سال میں نے صبوحی کو جنم دیا۔کئی سال بعد میرے بیٹا پیدا ہوا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس کا نام اسلم (5 اگست 1960) رکھا گیا۔میں تین بچوں میں بہت خوش تھی ۔اسلم سے مجھے جذباتی لگاؤ تھا۔ اس کا بچپن، بچپن کے واقعات ۔مجھے سب یاد ہیں۔اس کے والد بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔1979 میں میرے شوہر کا انتقال ہوا۔

ا۔ ج : پروفیسر شیخ مہدی حسین ناصر لکھنوی سے آپ کا تعلق کیا تھا۔؟ کیا ان کا اثر آپ پر ہے۔؟

م۔ ج : ارے بھائی وہ میرے دادا تھے ۔انھوں نے علی گڈھ سے تعلیم حاصل کی تھی ۔وہ علی گڈھ کے بعد کچھ دن یہاں رہے۔ بعد میں الہ آباد چلے گئے تھے ۔وہاں وہ اسبیلا تھو برن کالج میں لیکچرر اور پروفیسر ہوئے ۔وہاں وہ عربی ،فارسی اور اردو پڑھایا کرتے تھے۔ان کا مجموعہ 'نذرِ احباب'، 'غبارِ صحرا' اور ان کی معروف کتاب 'صنادید عجم' تو بہت سی یونیورسٹیز کے نصاب میں شامل ہے۔ وہ فارسی کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ویسے وہ فارسی سمیت سات زبانوں پر عبور رکھتے تھے ۔جب بھی لکھنو آتے تو خوب قصے سناتے ۔مجھ سے ان کا خاص لگاؤ تھا۔میرے اوپر ان کا کوئی خاص اثر نہ تھا۔

ا۔ ج : آپ نے تقسیم ہند کا واقعہ دیکھا ہوگا۔ملک کو دو حصے (ہندوستان، پاکستان) میں بٹتے دیکھا۔آپ کے تاثرات کیا ہیں۔؟ تقسیمِ ہند کا کوئی خاص اثر آپ پر بھی پڑا۔اس زمانے میں ادب پر کیا اثرات مرتسم ہوئے۔؟ فائدہ ہوا کہ نقصان۔؟

م۔ ج : آپ کے اندر ایک خامی ہے۔ایک ساتھ کئی سوال کر جاتے ہیں۔دراصل یہ آپ کا قصور نہیں۔نئی نسل ہی جلد بازی میں رہتی ہے ۔پتہ نہیں کس بات کی جلدی ہے ۔تقسیم کا ذکر نہ کریں۔(انھوں نے ساڑی کے پلّو سے آنکھیں صاف کیں) میں اس وقت بہت چھوٹی تھی ۔شاید چوتھی جماعت میں تھی ۔اسکول اور کلاسز بند ہوگئی تھیں۔ایک افراتفری کا ماحول تھا۔مسلمان اپنا بوریا

بستر سنبھال کر پاکستان جا رہے تھے۔انھیں گمان تھا کہ یہاں اب ان کا رہنا ٹھیک نہیں۔ہمارے بھی کئی رشتہ دار، وہاں چلے گئے۔میرا چھوٹا بھائی بھی چلا گیا۔پوری تہذیب کو خطرہ تھا۔زبان کو بہت نقصان ہوا۔رفیوجیوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔زبان پر کافی فرق پڑ رہا تھا۔دہلی میں جو مسلمان ہیں یہ سب مولانا آزاد کی تاریخی تقریر کا اثر تھا۔ان کی تقریر سن کر بہت سے لوگوں کے بندھے بستر کھل گئے۔

لکھنؤ کے گھروں میں ،بازاروں میں اردو کا چلن تھا۔بڑی نفیس اردو بولی جاتی تھی۔عربی صرف قرآن اور قاعدوں تک محدود تھی۔نہ ہم عربی سمجھ سکتے تھے، نہ پڑھ سکتے تھے۔بس قرآن پڑھنے پڑھانے کا رواج تھا۔ادب کا تو مجھے اس زمانے میں ہوش یا تمیز نہیں تھی۔ہاں مگر یہ حقیقت ہے کہ ادب کو خاصا نقصان ہوا ہوگا۔ملک کے تقسیم ہونے سے ظاہر سی بات ہے کہ ادب اور ادیب بھی بٹ گئے تھے۔ہاں اسے آپ تقسیم کا فائدہ مان سکتے ہیں کہ تقسیم کا موضوع ادبا و شعرا کو مل گیا۔لوگوں کا قتلِ عام ،عورتوں کی عصمت دری ، پاؤں شل کر دینے والا ہجرت کا سفر،مہاجرین پر ظلم وستم ،نیا ملک ،نئے پڑوسی، اعتبار کا قتل ،مذہب کے نام پر لوٹ کھسوٹ، پڑوسیوں کے حملے،۔۔ ان موضوعات پر بہت اچھا اور معیاری ادب لکھا گیا۔اسے آپ ادب کا فائدہ کہہ سکتے ہیں۔تقسیم نے جو درد و کرب تقسیم کیا تھا وہ آج تک دونوں طرف زندہ ہے۔نہ جانے یہ کسک اور ٹیس کب تک رہے گی ؟ (انھوں نے نم آنکھوں کو خشک کیا)

ا۔ج : ترقی پسندی اور جدیدیت کیا ہے۔؟ کیا ان میں سے کسی کے اثرات آپ کے فکشن پر ہیں۔؟

م۔ج : یہ سب نقادوں کے جادو ہیں۔ادب کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا جانا چاہیے۔پہلے ترقی پسندی آئی۔اس نے سب کی بات کی۔معاشرے کے فائدے کی بات کی۔ادب میں برابری کی بات شروع ہوئی۔حسن کا معیار بدلا۔مزدوروں اور کسانوں کو مرکزیت ملنے لگی۔میں نے لکھنا شروع کیا تو ترقی پسندی کا عروج تھا۔پھر میں نے اس کا زوال دیکھا۔جدیدیت نامی رجحان نے اس کی جگہ لینا شروع کی۔بہت سارے لوگ تھے جنھوں نے ترقی پسندی کو اپنایا۔خاص کر پریم چند،کرشن چندر،علی سردار جعفری ،ممتاز مفتی ،خدیجہ مستور،غلام عباس،بلونت سنگھ ،خواجہ احمد عباس ،کیفی اعظمی ،جاں نثار اختر،احمد ندیم قاسمی ، وغیرہ۔بعد میں کچھ لوگوں نے جدیدیت کو اپنایا۔جیسے انتظار حسین ،بلراج مین را،سریندر پرکاش، انور سجاد،احمد ہمیش،قمر احسن ،دیوندر اسّر ،جوگیندر پال،منشا یاد،ندا فاضلی ،مخمور سعیدی، مجید امجد،امراؤ طارق وغیرہ۔

جہاں تک میرا تعلق ہے تو یہ کہنا غلط ہوگا کہ میرے ادب پر کسی تحریک یا رجحان کا کوئی خاص اثر تھا۔ہاں میرے افسانے اور ناول عام لوگوں کا دکھ درد اور خوشیاں لیے ہوئے تھے۔عام لوگوں کے کردار،ان کے واقعات ،کھیل کود،زبان کی بھول بھلیاں،مٹتی ہوئی تہذیب ،لڑکیوں پر پابندی ،سماج کے نشیب و فراز،شادی بیاہ،رسم و رواج ،نئی اور پرانی تہذیب کا ٹکراؤ۔۔یہ سب تھا۔ایک خاص بات بتاؤں۔؟ ہمارے زمانے میں اتنی آزادی نہیں تھی۔لڑکیوں کے لکھنے پڑھنے پر بابندی تھی۔رسالے اور میگزین پر تو گھر والوں کی پینی نظر ہوتی۔افسانہ لکھنا اور ناول نویسی تو بہت دور کی بات تھی۔وہ تو میرے گھر والے ایسے نہ تھے۔وہ سب روشن خیال تھے۔میرے شوہر نے کبھی مجھے لکھنے سے منع نہیں کیا۔

ا۔ج: قرۃ العین حیدر کا تو عروج تھا۔آپ کی ان سے ملاقات ہوئی ہوگی۔آپ نے انھیں کیسا پایا۔؟

م۔ج : ان کی کیا بات تھی۔جب ہم نے لکھنا شروع کیا تو جن فکشن نگاروں کا جلوہ تھا ان میں انتظار حسین ،قاضی عبد الستار، نیر مسعود ،اقبال مجید ،غیاث احمد گدی، عصمت چغتائی اور عینی آپا تھیں۔قرۃ العین حیدر اپنی جوانی میں کسی ہیروئن سے کم نہ تھیں۔ جب میں ان سے پہلی بار لکھنؤ میں ملی۔تو میں ان کی شخصیت سے کافی مرعوب ہوئی۔انھیں دیکھ کر لگا کہ مجھے بھی ایسا ہی بننا چاہیے۔ کہانی اور ناول لکھنے چاہئیں۔ان کی شخصیت میں رعب تھا۔ان کی تحریریں سب سے الگ تھیں۔وہ کسی سے ڈرتی نہیں تھیں۔اچھے اچھے ان کے سامنے سرنگوں رہتے۔ان پر بڑے سے بڑے ادیب کا کوئی اثر نہیں تھا۔ناقدین کو تو وہ کچھ سمجھتی ہی نہیں تھیں۔ان کا مطالعہ بہت عمیق

تھا۔انھیں کئی زبانوں پر عبور تھا۔'' آگ کا دریا'' شائع ہونے کے بعد تو ان کی شہرت ملک کی سرحدوں سے بھی آگے نکل گئی تھی۔

ا۔ج : اپنی تخلیقات کے بارے میں کچھ بتائیں۔آپ کو کیسے لگتا ہے کہ آپ دوسروں سے الگ تھیں۔کیا آپ کی تخلیقات میں کچھ حقیقی کردار اور ان کی سچّی زندگی ہے۔؟

م۔ج : اپنی تخلیقات کے بارے میں کیا بولوں۔؟ مجھے تو سبھی پیاری لگتی ہیں۔میں نے گیارہ افسانوی مجموعے دیے اور تقریباً چالیس ناول لکھے۔زندگی میں جو کچھ ہوا یا جو کچھ ہوتا ہوا دیکھا، میں نے اسے لفظوں میں ڈھالا۔انھیں زبان دی۔لوگوں کے خاص کر عورتوں کے مسائل اُٹھائے۔

میرے افسانوی مجموعوں میں ہمیں جینے دو، خواب در خواب سفر، تیرے میرے دکھ، پُل صراط، پرندے کا سفر، اللہ تیری قدرت ، بوڑھا یوکلپٹس، پرندے کا سفر، دھوپ دھوپ سایہ اور ناولوں میں نئی بستی ، درد کا الاؤ ، گردشیں، دھوپ چھاؤں، آواز نہ دو ، آشیانہ ، نئی اُمنگیں ، فیصلہ ، جینے کے لیے ، راستے اور منزل، میں ساحلوں کی صدا، خاص ہیں۔ان میں سے آپ سب سے اہم پوچھیں گے ،تو میں لاجواب ہوں۔مجھے اپنی سبھی تخلیقات عزیز ہیں۔یہ سب میری اولاد ہیں۔ میں نے ہمیشہ دوسروں کی زندگی جی ہے۔ناول کے کردار لکھنے کے لیے مصنف کو اس میں ڈھلنا ہوتا ہے۔

زندہ کرداروں کی بات ہے تو میں کہوں کہ افسانوں اور نالوں میں سماج کا سچ ہی ہوتا ہے۔بالکل من وعن ہو تو اخبار کی خبر ہوتی ہے۔سماج کی سچائی کو اور سچے کردار کو پالش کرنا ہوتا ہے۔اسے اس کے مطابق زبان دینی ہوتی ہے۔میں نے بہت سے سچے واقعات اور آس پاس کے چلتے پھرتے کرداروں پر افسانے اور ناول لکھے ۔کنجی، ایسا ہی کردار ہے۔افسانہ 'عزت دار' اور 'کنجی' بھی حقیقی کہانی پر مبنی ہیں۔آپ انھیں پڑھیں ،خود محسوس کریں گے کہ یہ سماج کی خاص کر لکھنو کی حقیقت ہیں۔یہ ہمارا سچ ہے۔ہماری زندگی ہے۔

ا۔ج : ایک سوال کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔سنا ہے آپ نے بڑے دکھ اور غم دیکھے ہیں۔آپ کی تخلیقات میں بھی ان کا عکس ملتا ہے۔اگر آپ بتانا چاہیں کہ آپ نے ذاتی زندگی میں کوئی بہت بڑا دکھ یا غم دیکھا ہو۔تو بتائیں۔؟

م۔ج:اسلم صاحب آپ آزاد ہیں ، کچھ بھی پوچھ سکتے ہیں۔ میری زندگی تو کھلی کتاب ہے۔کوئی بھی پڑھ سکتا ہے۔میں نے زندگی میں بڑے بڑے دکھ دیکھے ہی نہیں بلکہ انھیں جھیلا بھی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ان کا عکس میری تخلیقات میں بھی ملتا ہے۔میں نے عرصے تک سوتیلی ماں کہلانے کا درد سہا اور اندر اندر روتی رہی۔ میری سسکیاں اور آنسو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔میں اندر اندر کوکھلی ہوتی گئی۔شادی کے بعد جب مجھے یکے بعد دیگرے دو بیٹیوں کی خوشی ملی۔تو میں پھولے نہ سمائی۔پھر تین چار سال بعد ایک بیٹا ہوا، میری خوشی اپنی انتہا بھول گئی۔میرا روم روم کھل اُٹھا۔مگر میری خوشی لوگوں کو راس نہیں۔میری بڑی بیٹی جس کی عمر سولہ سترہ سال ہوگی، کا انتقال ہو گیا۔میرے جسم کی دیواروں میں غم پانی کی مانند بیٹھ گیا۔میں خاموش ہوگئی۔چند سال بعد میں آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگی۔میں اپنے بیٹے اور بیٹی کو دیکھ کر ،ان کی معصومانہ باتوں اور حرکتوں نے میرے غم کو کسی قدر کم کیا۔میں نے خود کو افسانوں اور

ناولوں کی دنیا میں گم کر دیا۔میرا بیٹا جوانی کی دہلیز پر آ گیا تھا۔میں اس کے قد اور چہرے مہرے کو دیکھ کر خوش رہتی۔ بیٹے نے میٹرک،انٹر اور گریجویشن کیا۔پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کی۔ بلا کا ذہین اور خوبرو جوان تھا۔لکھنے کی صلاحیت کا کیا کہنا۔انگریزی پر عبور حاصل تھا۔انگریزی اسکولوں میں تعلیم پائی تھی۔صحافت میں کمال کیا۔انگریزی اخبارات میں بہت جلد اعلیٰ پوزیشنز پر مامور ہوا۔لکھنو سے بمبئی گیا، وہاں دھاک جمائی،دہلی کو روندا،بحرین میں انگریزی صحافت کے علم نصب کیے۔اچھے اچھے اس کی ترقی سے حسد کرتے تھے۔وہ صحافت کی دنیا کا ہیرا تھا۔

پھر قیامت کا وہ دن آیا۔31مارچ1995۔کسی ملازمت کے لیے وہ بمبئی گیا ہوا تھا۔دو تین ماہ بعد ہی وہ بمبئی سے ملازمت ریزائن کر کے نہ جانے کہاں چلا گیا۔ہم نے بہت تلاش کیا مگر مایوسی نے ہمیں چھوڑا نہیں۔ایک دن اچانک خبر آئی کہ گوا میں سمندر کی لہریں اسے نگل گئیں۔ہمیں یقین نہیں آیا۔(یقین تو آج تک نہیں ہے،وہ کوئی بچہ نہیں تھا کہ لہروں میں سما جاتا۔ضرور کچھ اور ہوا ہوگا۔اس کا ایک طرف کا چہرہ نیلا تھا اور اس کے چہرے پر مارنے کے داغ تھے۔کیا ہوا واللہ اعلم)مگر جانے والا جا چکا تھا۔وہ ہم سب کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے بہت دور چلا گیا تھا۔ بے شک اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہے مگر اس کی یادیں ہم سب کے لیے ایک روشن صبح کی مانند ہیں۔(ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔مجھے احمد ندیم قاسمی کے یہ اشعار یاد آ رہے ہیں۔)

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

ا۔ج : سوری۔۔معاف کریں۔۔۔

م۔ج : (وہ آنسو پونچھتے ہوئے گویا ہوئیں)نہیں کوئی بات نہیں۔میں اندر سے ٹوٹ گئی۔اس حادثے نے مجھے ہلا دیا۔میرا جسم زمین کی مٹی گیلی ہو چکی تھی۔ہزاروں آنسو تھے جو اندر جذب ہو کر دیواروں کو دیمک کی طرح چاٹ رہے تھے۔میں کیا کرتی۔؟ رونے اور سسکنے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔اب سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔کل نفس ذائقۃ الموت۔مرنے والے کے ساتھ، کوئی کب مرا ہے۔؟ میرا جینا کوئی جینا تھا۔میں تو ایک زندہ لاش تھی، جو اپنا وقت کاٹ رہی تھی۔اپنے ضعیف شانوں پر بیٹے کی ان دیکھی لاش اُٹھائے،ہر کسی نوجوان میں اسے تلاشتی رہی اور خود فریبی کا شکار ہوتی رہی۔ایک آدھ سال تک میں نے قلم نہیں اُٹھایا۔ہر جگہ مجھے اسی کی صورت دکھائی دیتی تھی۔پھر اس کی یاد میں ایک کہانی 'کہاں ہو تم ؟'لکھی۔ جسے ریڈیو اسٹیشن میں سن کر میری بیٹیاں پھپھک کر رو پڑی تھیں۔

ا۔ج : ناول کے لیے آپ کن لوازم کو اشد ضروری مانتی ہیں۔؟

م۔ج : آج کل تو ناول بے سر پیر کے بھی ہوتے ہیں۔لیکن اچھے ناول اور افسانے کے لیے فکشن کی قواعد جاننا ضروری ہے۔یہ بھی ضروری ہے کہ ناول کے اجزاء کا بھی پتہ ہو۔لیکن پڑھنے پڑھانے کے اصول وضوابط اور ہوتے ہیں۔ناول لکھنے جب بیٹھتے ہیں،تو بہت ساری چیزیں صرف کاغذی ہو کے رہ جاتی ہیں۔ناول اصل میں زبان و بیان کا کھیل ہے۔واقعے کا بیان ہی،واقعے کی نشست و برخواست کے حقیقی پن کو ظاہر کرتا ہے۔ناول میں کئی زندگیوں کا متوازی سفر ہوتا ہے۔واقعات کی ترتیب بہت معانی رکھتی ہے۔کردار ہوتے ہیں۔تصادم ہوتا ہے۔منظر نگاری بھی کبھی کبھی بہت ضروری ہوتی ہے۔یہاں عروج کے بعد کہانی ختم نہیں ہوتی بلکہ ایک کروٹ لیتی ہے۔ناول پہلے پھیلتا ہے۔پھر ایک نقطے پر مرکوز ہوتا جاتا ہے۔یہاں کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔اس میں ایک عہد سانسیں لیتا ہے۔لیکن ناول لکھنے کے لیے سب سے ضروری زبان اور بیان کا ہونا ہے۔

□□□

Prof. Aslam Jamshedpuri
Urdu Department
Chaudhary Charan Singh University, Ramgarhi
Meerut-250001(U.P)
aslamjamshedpuri@gmail.com

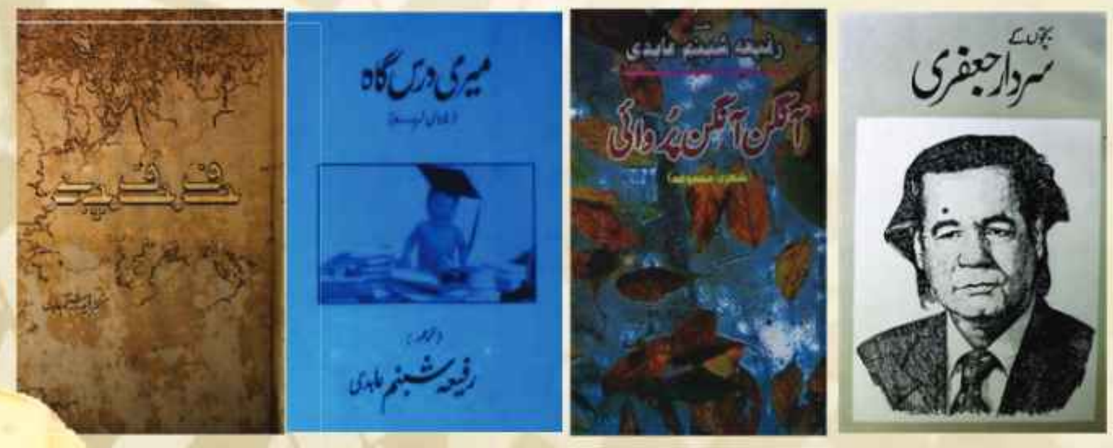

شعیب انصاری

نسائی شاعری کی معتبر شاعرہ
رفیعہ شبنم عابدی

آزادی کے بعد کی اردو شاعری کے منظرنامے میں نسائی شاعری اور تانیثیت کی تحریک کے مختلف النوع اثرات جن شاعرات پر پڑے ان میں ایک اہم نام رفیعہ شبنم عابدی کا بھی ہے۔

رفیعہ شبنم عابدی کا اصل نام سیدرفیعہ بیگم ہے۔ان کے والد میر سجاد علی شاکر مہاراشٹرا کے ضلع پونہ کے رہنے والے تھے۔ان کی والدہ کا نام سیدہ زینب تھا۔رفیعہ شبنم عابدی کی پیدائش 7 دسمبر 1943 کو ممبئی میں ہوئی۔

جہاں تک رفیعہ شبنم عابدی کی تعلیم کا سوال ہے تو انھوں نے 1965 میں ممبئی یونیورسٹی سے بی۔اے آنرس کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد اردو فارسی دونوں میں ایم۔اے کیا۔بعد میں بی۔ایڈ بھی کیا۔پی۔ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی سند بھی حاصل کی۔ممبئی کے انجمن اسلام سیف طیب جی گرلز جونیر کالج میں ان کی تقرری ہوئی۔1967 میں جناب سید حسن اختر عابد ساکن امروہہ ضلع سے ان کی شادی ہوگئی۔1976 میں انھوں نے برہانی کالج آف کامرس اینڈ آرٹس میں بحیثیت اردو فارسی لکچرر کے جوائن کیا۔1981 سے بیس برس تک وہ ریڈر اور صدر شعبہ رہیں۔پھر ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں صدر اور کرشن چندچئر پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔آٹھ نو برس کی چھوٹی عمر میں بچوں کے لیے نظمیں لکھ کر اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔1956 میں روزنامہ 'انقلاب' ممبئی میں 'بچوں کی دنیا' کے صفحے پر پہلی بار ان کی کہانی شائع ہوئی اور ان کی تخلیقات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ان کی شائع شدہ تصانیف کی ایک فہرست یوں بنائی جاسکتی ہے۔نظر نظر کے چراغ (تنقید) 1980، موسم بھیگی آنکھوں کا (شاعری) 1985 ملاوجہی اور انشائیہ (تحقیق) 1988۔ انوار سہیلی کی کہانیاں (فارسی سے ترجمہ) 1988، حرف حرف چہرے (تنقید) 1990، سردار جعفری۔شخصیت اور فن (تنقید) 1991، انمول کہانیاں (فارسی سے ترجمہ) 1992، اگلی رت آنے تک (شاعری) 1994، بچوں کے سردار جعفری (ادب اطفال) 1994، بچوں کے یوسف، ناظم (ادب اطفال) 1994، میری درسگاہ (مراٹھی سے ترجمہ) 1995، اردو شاعری میں تذکرہ فاطمہ الزہرا (تنقید وتحقیق) 1988، معاصر اردو ناول (تنقید) 2000ء، سردار جعفری: ایک مطالعہ (تحقیق وتنقید) 2001، آنگن آنگن پروائی (شاعری) 2009، نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں (شاعری) 2010۔

رفیعہ شبنم عابدی اردو کی ایک متحرک شاعرہ اور ادیبہ رہی ہیں۔ انھوں نے اپنی بنیادی پہچان غزل کی ایک قابل ذکر شاعرہ کی حیثیت سے بنائے رکھنے میں جو کامیابی حاصل کی اس کے پیچھے ایک خاص بات یہ ہے کہ غزل کے فکر وفن کی ایمائیت سے وہ بخوبی واقف ہیں۔انھوں نے نظمیں بھی خوب کہی ہیں لیکن جب ہم ان کی نظموں اور غزلوں کا مطالعہ تقابلی انداز میں کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ

غزلوں میں اپنے آپ کو زیادہ ترفع کے ساتھ ظاہر کرنے میں جو قدرت رکھتی ہیں اس کی نوعیت نظموں سے مختلف ہے۔اس سے پہلے کہ ان کی غزلوں کے حوالے سے بات کی جائے ،ان کی نظموں کے حوالے سے کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں ۔اس سلسلے میں ان کی ایک نظم ملاحظہ کریں۔

کل کی بات

یہ کل ہی کی بات تو ہے
جب اک تنہا آورہ بادل
میرے شہر کے آسمان پر منڈلایا تھا
جس
کی آنکھوں میں
خالی چھاگل بندھی ہوئی تھی
اور ماتھے پر پیاس لکھی تھی
ہاتھوں میں لفظوں کا کاسہ
تلوؤں میں کانٹوں کے گھونگرو
اور
سوکھے ہونٹوں پر صدیوں کی دھول جمی تھی
کتنی چھلکتی جھیلیں، ندیاں
اس نے پی لیں
میرے شہر میں
قحط اگا کر
اب وہ پھر
اپنی بستی کو لوٹ گیا ہے
جہاں کی سوکھی بیل
اسے بھگوان سمجھ کر
پوج رہی ہے!!

بیس مصرعوں پر مشتمل رفیعہ شبنم عابدی کی مذکورہ نظم ''کل کی بات'' اس اعتبار سے ایک خوبصورت اور قابل ذکر نظم ہے کہ اس نظم میں خیالات کا جو سلسلہ موصوفہ نے جس خاص ترتیب کے ساتھ قائم کیا ہے وہ استعاراتی بھی ہے اور نئے معنوی ابعاد کی تشکیل بھی کرتی ہے۔نظم میں جو خیال پیش ہوا ہے اسے ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ یہ بات زیادہ دنوں کی نہیں بلکہ کل ہی کی تو ہے کہ ایک تنہا اور آوارہ بادل میرے شہر کے آنگن میں منڈلایا تھا۔اس بادل کی آنکھوں میں خالی چھاگل بندھی ہوئی تھی یعنی وہ پیاسا تھا جس کے ماتھے پر پیاس لکھی تھی اور ہاتھوں میں لفظوں کا کاسہ، تلوؤں میں کانٹوں کے گھنگھرو اور اس کے ہونٹوں پر صدیوں کی دھول جمی تھی۔ یہاں تک آ کے خیال کا پہلا ٹکڑا مکمل ہوتا ہے۔مطلب یہ کہ نظم کے اس ٹکڑے یا حصّے میں رفیعہ شبنم عابدی نے پہلے ایک استعاراتی بیان خلق کیا ہے کل ہی کی بات کہ ایک تنہا اور آوارہ بادل کا ٹکڑا جو سراپا پیاس بن کر ہمارے شہر کے آسمان پر منڈلایا تھا اور پھر دوسرے ٹکڑے میں لفظ 'اور' کے بعد جو باتیں بیان ہوئی ہیں وہ یہ ہیں کہ اس تنہا اور آوارہ بادل نے کتنی چھلکتی جھیلوں اور ندیوں کو پی لیا تھا جس کے نتیجے میں قحط اگ آیا تھا اور پھر قحط اگا کر وہ بادل اپنی بستی میں لوٹ گیا تھا جہاں کی سوکھی بیل اس آوارہ اور تنہا بادل کو بھگوان سمجھ کر پوج رہی ہے۔

رفیعہ شبنم عابدی کی مذکورہ نظم 'کل کی بات' دراصل ایک استعاراتی بیان میں تبدیل ہوگیا ہے اور یہ بیان صورت حال کا وہ نقشہ پیش کر رہا ہے جس کی تطبیق کئی سطحوں پر کی جاسکتی ہے۔مجھے تو اس نظم کے مطالعے کے دوران یہ بات بھی متوجہ کرتی ہے کہ اس نظم میں رفیعہ صاحبہ نے تانیثی احساسات کو بھی بالکل نئی شکل دے کر پیش کیا ہے۔بادل اور وہ بھی تنہا اور آوارہ بادل، کھلنڈرے اور دل پھینک مرد کا استعارہ بھی ہوسکتا ہے، ساتھ ہی کئی ندیوں اور جھیلوں کو پی کر اپنی بستی کی جانب اس بادل کا لوٹ جانا دراصل عورت کے استحصال کا استعارہ بن جاتا ہے۔اس سلیقے اور بالواسطے طرز اظہار کی خوبیوں پر غور کیا جائے تو یہ نظم ایک نمائندہ نظم نظر آتی ہے۔اسی سلسلے کی اگلی کڑیوں کے طور پر رفیعہ شبنم عابدی کی نظم 'انتساب' ملاحظہ کریں۔

انتساب

درد کا یہ جہاں
حرف کا یہ خزینہ

لفظ و معنی کا گلزار

_____ احساس کا آئینہ
گرم جذبات کی تیز رو
اس دوانے کے نام
جس نے
انگلیوں کو تپش
جسم کو روشنی
روح کو تازگی دی
جاگتی آنکھ کو چاند تاروں کے سپنے
لبوں کو گلاب
ہر بن مو کو طرزِ تکلم دیا
میری بے نور پیشانی کو
اپنے ہی نام کے تین نقطوں کا جھومر سجایا
میرے خوابوں کے رنگ آنچل پہ سجدے کیے
میں کہ اک آب جو تھی
سمندر بنایا!!

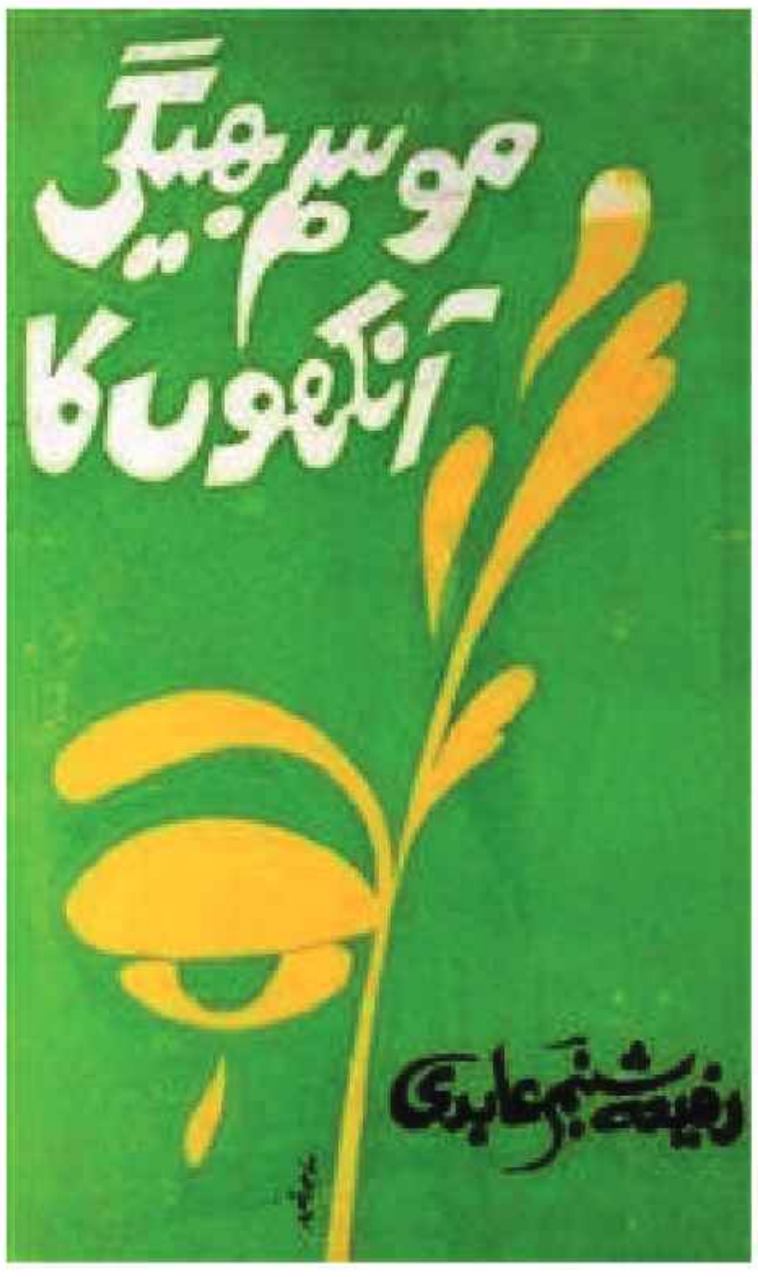

مذکورہ نظم 'انتساب' نسوانی احساسات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔اس نظم میں گرم جذبات ،انگلیوں کو تپش دینا، لبوں کو گلاب بنانا وغیرہ ایسے ٹکڑے ہیں جن کے ذریعے رومانی کے ساتھ ساتھ جنسی تجربہ بھی بیان ہوا ہے لیکن اس نظم میں تانیثیت کی تحریک کے زیر اثر ابھرنے والے باغیانہ تیور کی بجائے نسائی جذبے کی نمائندگی زیادہ نظر آتی ہے اور معشوقہ عاشق کے سامنے خود سپردگی کی تصویر بنی دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ اس کا محبوب اسے اس قدر چاہتا ہے کہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ آب جو سے سمندر بن گئی ہے۔

بحیثیت مجموعی رفیعہ شبنم عابدی کی نظمیں اپنے اندر جہاں معنی کو سمیٹے ہوئی ہیں۔ان کی نظموں میں خیالات کی بہترین ترتیب کے ساتھ ساتھ بہترین الفاظ کا انتخاب موجود ہے۔ان کی نظموں کے موضوعات بھی دلکش اور بامعنی ہوتے ہیں۔ان کی نظموں کی زبان استعاراتی بھی ہے اور تخلیقی بھی لہذا اردو نظم کے حوالے سے اگر ہندوستانی شاعرات کا کوئی مختصر انتخاب بھی عمل میں آئے تو اس میں رفیعہ شبنم عابدی ضرور شامل ہوں گی۔

جہاں تک رفیعہ شبنم عابدی کی غزلوں کا سوال ہے تو ان کی غزلوں میں جو باتیں ہمیں سب سے پہلے اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں وہ یہ ہیں کہ ان کی غزلوں کے اشعار میں روایت سے آگہی اور مانوس روایت میں تھوڑی سی توسیع کی جو کوشش نظر آتی ہے وہ شعوری ہونے کے باوجود آورد سے زیادہ آمد دکھائی دیتی ہے۔ان کی غزلوں کے کچھ نمائندہ اشعار ملاحظہ کریں:

رخساروں پر چھالے کیسے ہونٹوں پر انگارے کیوں
اس رستے سے گذرا ہوگا، موسم بھیگی آنکھوں کا

ہمارے جسم پہ زخموں کے پھول کیوں کہ کھلیں
کہ یہ بنا ہی ہوا خاک کربلا کا ہے

تڑپ رہی تھی ہر اک موج پیاسی ایسی تھی
شکست کھا گئے خنجر ، گلا بھی ایسا تھا

لہو کے داغ ابھی تک ہیں اس کے دامن پر
زمانہ دے نہ سکا ، خوں بہا بھی ایسا تھا

یہ اور بات ہے کہ ردا سر سے چھن گئی
ورنہ میں شاہزادیٔ حقدار تخت تھی

مذکورہ پانچوں اشعار میں سے پہلے شعر میں رفیعہ شبنم عابدی نے جس خیال کو پیش کیا ہے اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ رخسار پر چھالے اور ہونٹوں پر انگارے اس لیے ہیں کہ بھیگی آنکھوں کا موسم اس رستے سے گذرا ہوگا۔شعر میں رخساروں پر چھالے، ہونٹو ں پر انگارے اور بھیگی آنکھوں کا موسم ایسے کلیدی ٹکڑے ہیں جو تلازمے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ایک مکمل محاکاتی فضا معنوی ترسیل کے لیے پیدا ہوجاتی ہے ۔ یہ رعاتیں اور لفظی مناسبتیں غزلیہ شاعری کے وہ رمزیات ورسمیات ہیں جن سے مکمل آ گاہی کے بغیر دشت غزل میں قدم رکھنا عدم آ گہی کا بھرم کھولنے کے برابر ہے ۔ رفیعہ شبنم عابدی کا مذکورہ شعر ایک طرف اس بات کا غماز ہے کہ وہ اردو کی غزلیہ روایت سے اچھی طرح آ گاہ ہیں جس کی وجہ سے کچھ نیا احساس بھی اپنی غزلوں کے اشعار میں بہ آسانی سمو دیتی ہیں۔

دوسرا شعر رثائی ادب اور غزل کے ایجاز واختصار سے واقفیت کی بنا پر ہمیں فوراً متوجہ کر لیتا ہے۔شعر میں جو مضمون یا خیال پیش ہوا ہے اسے ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ ہمارے جسم میں زخموں کے پھول اس لیے کھلتے ہیں کہ ہمارا جسم کربلا کی مٹی سے بنا ہے ۔اس شعر میں بھی اپنی روایت سے مکمل آ گہی کا اظہار ہوا ہے۔کربلا کی مٹی کی رعایت سے جسم میں زخموں کے پھول کا کھلنا تخیل کی کرشمہ سازی کا کمال بھی ہے اور لفظوں کے درمیان واقع معنوی خلا کو پر کرنے کا ایک طاقتور ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔

تیسرے شعر کا پس منظر کربلا کے واقعے کی جانب اشارہ کرتا ہے۔شعر میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ کہ ہر ایک موج پیاس کی شدت سے تڑپ رہی تھی اور خنجر بھی شکست کھا رہے تھے کیونکہ یہ خنجر جس گلے پر چلنا چاہتے تھے وہ گلا بے حد سخت جان تھا یعنی کوئی عام گلا نہیں تھا۔ظاہر ہے کہ شعر کے پورے پس منظر میں کربلا یا کربلا سے متعلق کسی افراد کا کوئی ذکر یا اشارہ موجود نہیں لیکن پھر بھی قاری کا ذہن کربلا کی جانب راجع ہوجاتا ہے۔یہ ہے غزل کے حسن کا رکھ رکھاؤ۔ایسے ہی اشعار کی بنیاد پر رفیعہ شبنم عابدی کے بارے میں ان کے نقادوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ان کی طبیعت کا جھکاؤ نظم کی بہ نسبت غزل کی جانب زیادہ ہے۔

چوتھے شعر میں اس خیال کا اظہار ہوا ہے کہ ابھی تک اس کے دامن پر لہو کے داغ نمایاں ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ قتل کے بدلے میں دیا جانے والا خوں بہا ہی اتنا نرالا اور انوکھا تھا جسے زمانہ ادا ہی نہ کر سکا۔اس شعر کے مفہوم میں بھی لفظ سے زیادہ باتیں پس لفظ چھپی ہوئی ہیں۔''قتل اور خوں بہا'' اس شعر کے مرکزی تلازمے ہیں جن سے اردو شاعری کا قاری پہلے ہی سے واقف ہے ۔لہذا بہت سی باتیں جو قاری کے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتی ہیں، رفیعہ شبنم عابدی بڑی آسانی سے اس کی توسیع کر دیتی ہیں اور بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔

پانچواں شعر اس خیال پر مبنی ہے کہ یہ اور بات ہے کہ ردا سر سے چھن گئی ہے یعنی ہماری بے توقیری کی جارہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ہی وہ شاہزادی ہوں جو واقعی تخت کی حقدار ہے۔ردا کا سر سے چھن جانا بھی کربلا کی طرف ہمارے ذہن کو موڑ دیتا ہے اور شاہزادی کا تخت کا حقدار ہونا مزید معنی کی توسیع کر دیتا ہے۔اس شعر کی بنیاد پر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ رفیعہ شبنم عابدی اپنی غزلوں کے اشعار میں اسلامی تاریخ وروایات سے بھرپور استفادہ کرنے میں حد درجہ کامیاب دکھائی دیتی ہیں۔

مذکورہ پانچوں اشعار کے مفہوم اور تجزیے پر اگر نظر مرکوز رکھی جائے تو رفیعہ شبنم عابدی کی غزلیہ شاعری کے بارے میں یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ وہ اردو غزل کی روایت کی تمام تر باریکیوں سے اچھی طرح واقف ہیں اس لیے ان کی غزلوں کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں کیونکہ ان کی غزل کے مطالعے سے قاری خود اپنے ذہن کی توسیع ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔مذکورہ غزلیہ خوبیوں کے پس منظر میں رفیعہ شبنم عابدی کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ کریں۔

بجا کہ تجھ سا رفوگر نہ مل سکا لیکن
یہ تار تار وجود ایک دن تو سینا تھا

یہ ہم ہی تھے جو بچا لائے اپنی جاں دے کر
ہوا کی زد پہ تری یاد کا سفینہ تھا

بس ایک بار ان آنکھوں کو اس نے چوما تھا
ہمیشہ نم ہی رہا آنسوؤں سے کاجل پھر
پھر اب کی بار لہو رنگ بارشیں برسیں
کسی نے کاٹ دئے ہیں سروں کے جنگل پھر

اپنے لفظوں کے تاثر کا ذرا دھیان رہے
حاکم شہر کبھی لوگ بھی اڑ جاتے ہیں

نیکیاں بانٹتے رہنے کی سزا لازم ہے
پارہ پارہ ہے بدن کوئے جزا کے اس پار
یہ شام کا بازار ہے یا کرب وبلا ہے
ہر خواب مرا وقت کے نیزے پہ چڑھا ہے

ایک مدت سے تمنا ہے کچن میں تیرے
چوڑیاں بن کے بجوں، زلف کی صورت مہکوں

اس کو پھولوں ہی کے بستر پہ سلانا یارب
جس نے کانٹے مرے آنچل میں سجا رکھے ہیں!

میں بھی رادھا سے کوئی کم تو نہیں ہوں شبنم
سانولے رنگ کا میرا بھی تو گردھاری ہے

ویسے تو دل کا کوئی دریچہ کھلا نہ تھا
اے زندگی تو کون سے رستے سے آگئی

بحیثیت مجموعی جب ہم رفیعہ شبنم عابدی کے شعری سفر اور سرمایے پر نظر کرتے ہیں تو وہ نظم کی ایک اچھی اور غزل کی ایک نمائندہ شاعرہ کی حیثیت سے ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ان کی شاعری میں گھر آنگن بھی نظر آتے ہیں اور سماجی وسیاسی مسائل بھی۔ داخلیت پسندی بھی نظر آتی ہے اور خارجیت پسندی بھی۔ان کے یہاں عشق کی دھیمی دھیمی آنچ بھی محسوس ہوتی ہے اور ٹوٹتے برتن کی آواز کے ساتھ ساتھ چوڑیوں کی آواز بھی ہمیں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ایک متوسط طبقے کی عورت کے مسائل اور دلچسپیوں کے سامان ان کی نظموں اور غزلوں میں بکھرے پڑے ہیں۔

❐❐❐

Dr. Shoaib Ansari
Village- Chapatoli, PO- Bijuliya
PS- Ratu Dist- Ranchi-835222(Jharkhand)
Mob: 8789275521

مصباح انصاری

جوہر مگہری اور ان کی نظم 'عورت'

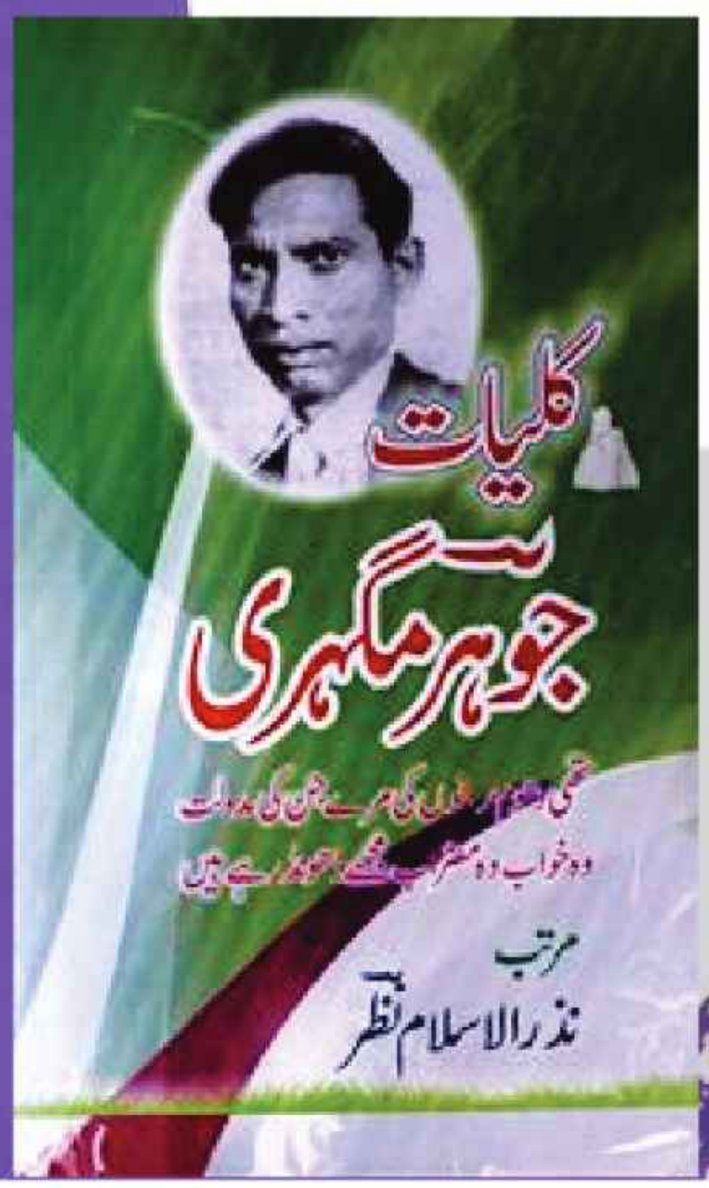

جوہر مگہری کا اصل نام محمد عبدالعزیز اور تخلص جوہر، جائے پیدائش کی نسبت سے مگہری لگایا اور جوہر مگہری کہلائے۔ ان کی ولادت یکم جولائی1920 کوعظیم صوفی شاعر کبیر کے آستانے کے قریب مگہر میں ہوئی۔ قصبہ مگہر پہلے ضلع گورکھپور کا حصہ تھا، بعد میں اسے ضلع بستی میں شامل کر دیا گیا۔ سرزمین مگہر میں مدفون عظیم صوفی شاعر کبیر داس کی نسبت سے حکومت اتر پردیش نے 5 ستمبر 1997 کو ایک نیا ضلع سنت کبیر نگر تشکیل کیا تو مگہر سنت کبیر نگر کا حصہ ہوگیا جو اس ضلع کا اہم سیاحتی مقام بھی ہے۔ جوہر مگہری کے والد کا نام ریاست علی تھا جو لکھنؤ کورٹ میں منشی تھے اسی سبب سے منشی ریاست علی کہلائے۔ جوہر مگہری کے گھر کا ماحول علمی تھا ابتدائی تعلیم مگہر میں حاصل کی اس کے بعد گورکھپور کے جارج اسلامیہ انٹر کالج، گورکھپور اب (میاں صاحب اسلامیہ انٹر کالج) سے ہائی اسکول کی سند حاصل کرنے کے بعد گورکھپور ریلوے کے اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہو گئے۔انھیں شعر وشاعری سے بے انتہا لگاؤ تھا۔'' ان دنوں گورکھپور ریلوے میں کئی اچھے شاعر بھی تھے جن میں احمر گورکھپوری، صفوی بارہ بنکوی، مسلم انصاری، محشر بریلوی، عمر قریشی، شمیم صابری، رضا وارثی، کنہیالال منظر، بند باسنی پرساد قمر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔"1 جس کی وجہ سے صبح شام وہاں شعر وشاعری کا ذکر عام تھا۔ وہاں کی شعری وادبی فضا دوران ملازمت انھیں اپنے ادبی ذوق کو سنوارنے اور نکھارنے میں مددگار ثابت ہوئی۔

جوہر مگہری نے شاعری کے میدان میں خوب طبع آزمائی کی اور اپنے منفرد اور مختلف انداز سے ادبی حلقوں میں اپنی الگ شناخت قائم کی۔ جوہر مگہری نے عہد غلامی میں ہوش سنبھالا ہر طرف افرا تفری کا ماحول تھا۔ غلامی کے دور میں انھوں نے جس گھٹن اور بے چینی کو محسوس کیا اسے اپنی انقلابی اور باغیانہ نظموں میں قلم بند کر دیا اور حصول آزادی کے بعد قومی یکجہتی کے گیت گائے۔ ان کی شاعری کے حوالے سے معروف فکشن نگار ڈاکٹر عبیداللہ چودھری رقمطراز ہیں:

> ''انھوں نے تو اپنی شاعری کا آغاز ہی قومی یکجہتی، یگانگی اور اشتراکیت کی بنیاد پر کی۔ ان کی شاعری عوام الناس کے لیے ایک درس ہے جو ہمیں آپسی میل ومحبت، اتحاد اور امن و شانتی کا سبق سکھاتی ہے۔'' 2

جوہر مگہری کی شاعری میں ہر رنگ پورے آب وتاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں میں جہاں سماج کے مختلف مسائل کی عکاسی نظر آتی ہے وہیں ان کی غزلیں بھی اپنا الگ لہجہ رکھتی ہیں۔ ان کا رجحان ترقی پسندانہ تھا اس بات کی وضاحت ان کو قریب سے

دیکھنے اور جاننے والے بزرگ شاعر ومعروف صحافی عاصم گونڈوی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''وہ کمیونزم اور ترقی پسند شاعر تھے۔ یہاں انکو مجنوں گورکھپوری اور ایم کوٹھیاوی راہی جیسے ہم خیال و ہم مشرب قدردان مل گئے پھر کیا تھا، استراکیت کی راہ پر تیز رفتاری کے ساتھ وہ آگے بڑھتے گئے اور یہی ان کی پہچان بن گئی۔''3

جوہر مگہری کی شاعری میں سماجی انصاف اور برابری کا پیغام صاف دکھائی پڑتا ہے۔ جوہر مگہری کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ سرزمین مگہر سے کبیر کے بعد شاعری کرنے والے شخص اول ہیں۔ اس حوالے سے احساس مگہری اپنے مضمون مگہر اور جوہر مگہری میں رقمطراز ہیں:

''مرحوم شعرا گل محمد پہلوان گل مگہری، ڈاکٹر اسرار احمد خان اسرار مگہری و ماسٹر لقمان انصاری لقمان مگہری نے اپنی حیات میں جوہر مگہری کو کبیر کے بعد پہلا شاعر تسلیم کیا ہے اور جب بھی گفتگوئے سخن ہوتی تو جوہر صاحب کا ذکر ضرور ہوتا۔''4

جوہر مگہری کی زندگی میں ان کا کوئی شعری مجموعہ منظر عام پر نہیں آسکا۔ 24 جولائی 1987 میں ان کی وفات کے 37 سال بعد ان کے فرزند نزر الاسلا نظر مگہری نے 2024 میں ان کی کلیات شائع کر ادبی حلقوں میں انھیں پھر سے زندہ کر دیا۔ 428 صفحات پر مشتمل کلیات میں جوہر مگہری کی حیات و خدمات کے متعلق 7 مضامین، ایک نعت پاک، 56 نظمیں، 129 غزل، 180 قطعات اور 20 متفرق اشعار شامل ہیں۔ بقول مرتب ان کے کچھ کلام تلف بھی ہو گئے۔ یہ تو رہا جوہر مگہری کا تعارف۔ اس مضمون میں جوہر مگہری کے تعارف کے ساتھ ساتھ ان کی نظم 'عورت' کا جائزہ بھی مقصود ہے۔ جو ''کلیات جوہر مگہری'' میں صفحہ 56 سے 58 پر درج ہے۔ 1947 میں کہی گئی اس نظم میں کل 20 اشعار میں۔ اس کی بحر ہزج مثمن شالم (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن) ہے۔ اردو شاعری میں عورت کے حوالے سے جوہر مگہری سے قبل، ان کے عہد اور ان کے بعد بھی شعرا نے اپنے خیالات کو نظم کیا ہے۔ اردو نظم کے فروغ میں غیر معمولی خدمات انجام دینے والے اردو کے اولین ناقد اور بلند مرتبہ شاعر مولانا الطاف حسین حالی نے "عورتوں کا درجہ" بیان کرتے ہوئے لکھا:

اے ماؤ! بہنو! بیٹیوں! دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزت تم ہے
تم آس ہو بیمار کی، ڈھارس ہو تم بیکار کی
دولت ہو تم نادار کی عشرت میں عشرت تم سے ہے

اسرار الحق مجاز نے "نوجوان خاتون سے" کہا کہ:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

ساحر لدھیانوی نے عورتوں کے حالات و دل چیر دینے والی حقیقت کو اس طرح نظم کیا:

لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں
روح بھی ہوتی ہے اس میں یہ کہاں سوچتے ہیں

اسی ضمن میں فہمیدہ ریاض نے اپنی نظم "انقلابی عورت" میں ،عورت کی قربانی اور اس کے حاصل کا بیان بڑے حساس انداز میں کیا ہے۔ 'عورت' عنوان پر مختلف شعرا نے نظمیں کہیں ہیں جن میں کیفی اعظمی، حبیب جالب، رہبر جونپور، مینا مقوی، کی نظم ''عورت'' اردو ادب میں الگ مقام رکھتی ہے۔ مینا نقوی نے اپنی نظم میں عورت کی زندگی میں درپیش مسائل کا احاطہ بڑے کی سلیقے سے کیا ہے۔ انھوں نے زمانے کو اس کے ماضی اور حال کی روشنی میں آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے نظم کا آخری بند پیش خدمت ہے:

جانا گیا نہ مجھ کو کبھی میرے نام سے
رشتوں میں مجھ کو باندھا گیا اہتمام سے
نسبت جو لوگ اپنی بتاتے ہیں رام سے
بن باس مجھ کو دیتے ہیں سیتا کے نام سے
باتوں میں اور عمل میں صداقت نہیں ملی
عورت ہوں میں مجھے مری عظمت نہیں ملی

رہبر جونپوری نے اپنی نظم میں عورت کی مختلف رشتوں میں

شناخت کی ہے اور ہر رشتے کے تئیں اس کے جذبات، احساسات، خدمات اور قربانی کی تصویر کو پیش کیا ہے تو حبیب جالب نے اپنی نظم میں اپنے مزاج کے مطابق عورت کو سماج میں انقلاب برپا کرنے اور اپنا وجود ثابت کرنے کا کھلا پیغام دیا ہے۔ کیفی اعظمی نے اپنی نظم میں عورت کے مختلف رنگ، آہنگ و جذبات کی ترجمانی کی ہے اور عورت کو یہ پیغام بھی دیا ہے کہ اسے رکنا نہیں ہے۔ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا ہے اور دنیا کو اپنی اہمیت بتانے کے لیے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلتے رہنا ہے نظم سے ایک بند ملاحظہ ہوں:

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں

اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خم گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں

اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

ان تمام حوالوں کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ عورت کے تعلق سے بہت سی گفتگو نظم کی صورت میں بیان کی گئی ہے۔ اسی میدان میں جب جوہر مگہری اترتے ہیں تو ایک نئی راہ ہموار کرتے ہیں اور اپنی نظم میں بڑی بے باکی اور صاف گوئی کے ساتھ عورت کے مرتبے کا تعین کرتے ہیں۔ پوری نظم اسی خیال کے گرد گردش کرتی ہے کہ عورت نہ ہوتی تو دنیا کیسی نظر آتی۔ نظم کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

نہ ہوتی دہر میں عورت تو تاریکی نظر آتی
چراغِ زندگی کی روشنی پھیکی نظر آتی

نظم کا پہلا شعر ہی قاری کے دل و دماغ پر ضرب لگاتا ہے اور اسے سوچنے و فکر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ مسلسل ایک کے بعد ایک 19 شعر اسی خیال کے پیش نظر رقم کر دیتے ہیں اور ہر شعر میں ایک نئے زاویے سے عورت کی عظمت اور برکت کی طرف توجہ مرکوز کراتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔:

وبال دوش ہوتی زندگی انسان زادوں پر
گھٹائیں چھائی ہوتیں یاس کے رنگیں ارادوں پر
مسرت کے حسیں لمحات بھی مفقود ہو جاتے
علاجِ سوزشِ دردِ جگر بے سود ہو جاتے
الم کی بارشوں سے آتشِ دل سرد ہو جاتی
تمنائے دلی سینے میں اس خود درد ہو جاتی
چھلک جاتا زرا سی دیر میں پیمانۂ ہستی
مکمل ہی نہ ہوتا حشر تک افسانۂ ہستی

ان اشعار پر غور کریں تو ہم پاتے ہیں کہ جوہر مگہری نے کیا خوبصورت انداز بیاں اختیار کیا ہے اور ہر ایک زاویے سے ہمارے ذہنوں کو سوچنے اور غور و فکر کرنے پر مجبور کرنے کی سعی کی ہے۔ عورت کی بڑائی کو اس بیبا کی اور کھلے دل سے تسلیم کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ نہ صرف عورت کی قدر و منزلت کے حامی ہیں بلکہ انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ دنیا کی نیرنگی کا باعث عورت کی پاک ذات ہے۔ اسی سے آرزو ہے، مسرت ہے اگر عورت کا وجود نہ ہوتا تو انسان پوری عمر بھٹکنے کے بعد بھی زندگی کا سراغ نہ پاتا، نہ ہی ان کے دلوں میں کیف و سرور اور درد و غم کے جذبات پیدا ہوتے۔ آگے کے اشعار میں شاعر کا پرواز تخیل اور لفظوں کا انتخاب دیکھیے اور سر دھنیے:

نہ ہوتی میکشی ہوتے نہیں تعمیر میخانے
سنے جاتے نہ حسن و عشق کے رنگین افسانے

مقید دل میں ہوتا ہی نہیں جذبات کا عالم
کبھی ہوتا نہیں بیدار احساسات کا عالم

بہشتِ گوش ہوتا یوں نہ ذکرِ گیسو و شانہ
جوانی کی نگاہوں میں نہ ہوتا کوئی افسانہ

تمنا آنسوؤں سے تشنگی اپنی بجھا لیتی
جوانی تنگ بے کیفی سے آکر زہر کھا لیتی

یہاں جوہر مگہری کا قلم پوری آب وتاب کے ساتھ اپنا جوہر دکھاتا نظر آتا ہے۔عورت سے ہی زندگی کی بہار ہے۔اسی کی ذات سے زندگی میں غم وخوشی کی لہر ہے۔تمنا

کا آنسوؤں سے تشنگی بجھالینا اور جوانی کا بے کیفی سے تنگ آ کر زہر کھالینا یہ شاعر کے بلند تخیل اور قلم پر گرفت کی بین کی دلیل ہے۔ شاعر نظم میں آگے کہتا ہے کہ عورت نہ ہوتی تو متوالی بہاروں پر خزاں کا رنگ غالب نہ ہوتا۔ دلکش نظارے غم و آلام میں ڈوبے، ماتم کرتے نظر آتے اور یہ آج جس میں نیرنگی ہے، اتار چڑھاؤ ہے یعنی زندگی میں جو چاشنی ہے۔ وہ اس سے خالی ہوتی۔ کسی کو زندگی کی حرص وہوس نہ ہوتی اور نہ ہی رباب زیست پر نغمہ سرائی ہوتی، نہ ہی دنیا میں تمام فلسفیانہ خیالات تحریر کیے جاتے:

رباب زیست پہ نغمے کبھی گائے نہیں جاتے
رموز فلسفہ تحریر میں لائے نہیں جاتے

عورت کی عظمت کے اعتراف میں غالباً اسی خیال کو شاعر مشرق علامہ اقبال نے ضرب کلیم میں اس طرح پیش کیا:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں
مکالمات افلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جوہر مگہری کا مطالعہ وسیع تھا۔انھوں نے اساتذہ کے کلام کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ وقت ضرورت ان سے استفادہ بھی کیا ہے۔نظم ترقی کی منزل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے اور شاعر بلا جھجک کہہ اٹھتا ہے:

نظامِ بزمِ امکاں میں کسی شے کی کمی ہوتی
جبینِ ارتقا پہ جہل کی کائی جمی ہوتی
نہ طے انساں سے اتنی ارتقائی منزلیں ہوتیں
نہ یوں آراستہ علم و ہنر کی محفلیں ہوتیں

ان اشعار میں ہم دیکھتے ہیں کہ جوہر مگہری نے آج کے ترقی یافتہ دور سے غالباً 75 سال قبل کس طرح دنیا کو بتایا کہ عورت کس شے کا نام ہے۔ دنیا میں اس کا وجود صرف اس کا وجود نہیں بلکہ سارے عالم کا وجود ہے۔زمانے نے ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں اور تاریکی سے نکل کر روشنی کی طرف گامزن ہوئے ہیں۔ یہ سب اسی صنف نازک کی دین ہے۔نظم کا اختتام اس شعر کے ساتھ ہوتا ہے:

بہاروں کے مناظر بھی سکوں دشمن نظر آتے
جہنم کی بھڑکتی آگ میں خرمن نظر آتے

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو ادب کی دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک گوہر نایاب پوشیدہ ہیں۔جوہر مگہری پہلے ایسے شاعر یا ادیب نہیں جنھیں اپنی خدمات کے مقابلے شہرت و اہمیت نہیں ملی۔ادبی تاریخ ایسے شعرا و ادبا سے بھری پڑی ہے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ادبی دنیا نے دیر ہی سے سہی ان کی خدمات کا اعتراف ضرور کیا ہے۔بہت سے ادیب وشعرا کو ان کے عہد میں شہرت و بلندی ملی تو بہت ایسے بھی ہیں جن کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے برسوں بعد ادب نے تسلیم کیا اور آج ان کا مقام اردو ادب میں بلند و بالاتر ہے۔اس کی سب سے بڑی مثال نظیر اکبرآبادی ہیں جنھیں اپنے عہد میں لوگ شاعر ماننے کو تیار نہ تھے لیکن وقت بدلا اور آج نظیر بے نظیر ہیں۔اسی طرح جوہر مگہری بھی اب تک گمنانی کے سائے تلے ہیں۔امید ہے ان کے تعلق سے یہ چند باتیں جاننے کے بعد ادب نواز لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں گے اور ادبی دنیا میں انھیں وہ مقام مل سکے گا جس کے وہ حقدار ہیں۔

□□□

Misbah Ansari
T.G.T. Urdu
Pm Shri School Jawahar Navodaya Vidyalaya,
Dabhasemar
Faizabad(Ayodhya)-224133 (U.P)
Mob-8858273875
misbahgorakhpuri0089@gmail.com

نزہت فاطمہ

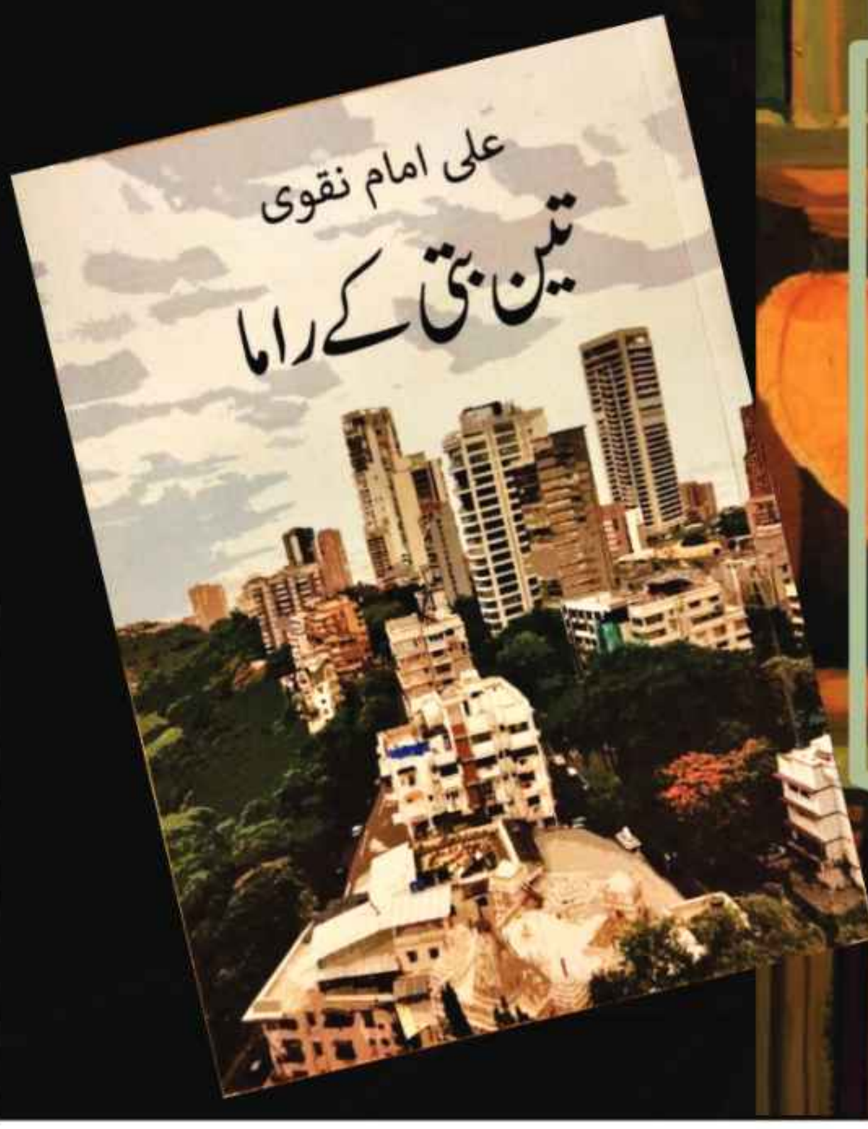

ناول ’تین بتّی کے راما‘ کا فکری وفنی جائزہ

اردو ادب میں 1970 کے بعد لکھنے والوں کی جو نسل ہمارے سامنے آئی اس میں علی امام نقوی ایک اہم نام ہے۔ پہلے پہل علی امام نقوی بطور افسانہ نگار ہمارے سامنے آئے اور ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ’نئے مکان کی دیمک‘ منظرِ عام پر آیا۔اس کے بعد ان کے مزید چار مجموعے اور شائع ہوئے۔ان کے افسانہ ’ڈونگر واڑی کے گدھ‘ کو کافی مقبولیت ملی جو آج بھی ادبی حلقوں میں اپنی مخصوص جگہ بنائے ہوئے ہے۔ افسانوں کے علاوہ علی امام نقوی کے دو ناول بھی شائع ہوئے ’تین بتّی کے راما‘ اور ’بساط‘۔ ان کے ناول ’تین بتّی کے راما‘ کو کافی شہرت ملی جو آج بھی اپنے موضوع اور اسلوب کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

ناول ’تین بتّی کے راما‘ سب سے پہلے رسالہ ’قلم‘ میں قسط وار شائع ہوا تھا جو بعد میں قلم پبلی کیشنز بمبئی کی جانب سے 1991 میں کتابی شکل میں چھپا۔ یہ ناول اپنے منفرد موضوع اور مخصوص زبان و اسلوب کی وجہ سے ادبی حلقے میں کافی چرچہ میں رہا اور آج بھی اپنی ایک الگ شناخت قائم کیے ہوئے ہے۔

اس ناول میں علی امام نقوی نے ممبئی کی تہذیب و ثقافت، معاشرت، اقتصادیات، جنسی اور نفسیاتی محرومی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔علی امام نے اس ناول میں ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جس پر لکھنا آسان نہیں تھا۔انھوں نے جنس کے موضوع پر ناول لکھ کر نہ صرف ممبئی کے نچلے طبقے کی زندگی کے تلخ حقائق کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے بلکہ وہاں کے اعلیٰ اور معزز طبقے کی گھناؤنی سچائیوں سے بھی نقاب اٹھایا ہے۔اس ناول میں نچلے اور اعلیٰ طبقے کی اخلاقی پستی ہی نہیں بلکہ ان کی اقتصادی، معاشرتی ومعاشی، جنسی اور نفسیاتی الجھنوں اور ان کی محرومیوں کو بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے ناول ’تین بتّی کے راما‘ ایک دلچسپ ناول ہے۔ اس ناول میں ممبئی میں رہنے والے ساہوکاروں اور راماؤں کی زندگی کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار ’سکّو‘ ہے۔’سکّو‘ ایک بائی ہے جو ساہوکاروں کے یہاں گھر کے کام کرتی ہے۔علی امام نے اس ناول میں سیٹھوں اور بائیوں کے ناجائز تعلقات اور ان کے جنسی استحصال کا پردہ فاش کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد شارب اس ناول پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’نقوی نے ہندوستان کے عروس البلاد شہر ممبئی میں سیٹھوں اور سیٹھانیوں کے کالے کرتوتوں، استحصال زدہ راماؤں، داداؤں اور موالیوں کی غنڈہ گردی، راماؤں کے تئیں مالکوں کا رویہ، آیاؤں یعنی مفلوک الحال عورتوں کا جنسی استحصال، عورتوں کی خواہشات اور اس کا ردِعمل، مردوں کی بے راہ روی اور گندی ذہنیت، بڑی بڑی پارٹیوں میں ہونے والی بداعمالیاں اور ممبئی اور دیگر لغویات وفضولیات راماؤں کی زبانی

ممبئی کے خاص لہجے اور انداز میں پیش کیا ہے۔''1

یہاں صرف بائیوں کا جنسی استحصال نہیں ہوتا بلکہ راما بھی سیٹھانیوں کے ہاتھوں استعمال کیے جاتے ہیں۔تین بتّی کے چورا ہے پر راماؤں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے سیٹھ اور سٹھانیوں کے عیبوں کا پردہ فاش ہوتا ہے۔علی امام نے اس ناول میں رئیسوں کے کھوکھلے اسٹیٹس اور گھٹیا سوچ کو بڑے ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔جب سٹھانی کوسکو اور اپنے شوہر کے تعلق کا پتہ چلتا ہے تو وہ کچھ اس طرح ردِعمل ظاہر کرتی ہے:

''کچھ تو اسٹیٹس کا خیال کرتے۔۔۔۔۔وہ دوکوڑی کا ڈرائیور۔ہمارے گھر آکر ہمیں گالیاں دے گیا۔اس نے تمھارے سامنے مجھے اپنے ساتھ سلانے کی بات کی۔کیونکہ تم نے اس کی دوکوڑی کی پریمیکا کو اپنے بیڈ پر بلایا تھا۔اسے اپنے ساتھ سلایا تھا۔مجھے۔۔۔ ۔مجھے تمھاری حرکت پر نہیں،تمھاری چوائس پر اعتراض ہے۔کتنا گھٹ گیا ہے تمہارا ٹیسٹ جھاڑو کٹکا کرنے والی،سکّو بائی۔چھی چھی چھی۔۔۔۔۔۔''2

سٹھانی کو بس اپنے اسٹیٹس کا خیال ہے اسے شوہر کی غلطیوں سے کوئی واسطہ نہیں۔اسے پرواہ ہے تو بس اس بات کی کہ اس کے شوہر نے ایک چھوٹی ذات کی لڑکی کو اس پر ترجیح دی ہے۔

علی امام نقوی نے اس ناول میں سیٹھوں اور راماؤں کے دو متضاد پہلوؤں کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ایک طرف جہاں ان کے اندر بے راہ روی موجود ہے وہیں دوسری طرف وہ ایک دوسرے کے لیے ہمدردی کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔جب موہن کو پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے تو ڈھونڈو اور سارے راما مل کر اس کی مشکل کو حل کرتے ہیں۔ان کے اس رویہ سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے اندر انسان دوستی کا احساس ابھی باقی ہے۔اخلاقی پستی کے باوجود ان کے اندر ابھی بھی انسانیت زندہ ہے۔یہاں سیٹھ بھی اپنی دریا دلی اور ہمدردی دکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔جب ڈھونڈو موہن کی بہن کی شادی کے لیے سیتھ سے پیسے مانگتا ہے تو سیتھ بغیر کسی پس وپیش کے اپنی خوشی سے پیسے دے دیتا ہے۔

ناول 'تین بتّی کے راما' میں علی امام نقوی نے محبّت اور جنس کے دو مختلف پہلوؤں کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔یہاں ایک طرف وِنے ہے جو سکّو کو حاصل تو کرنا چاہتا ہے لیکن شادی سے انکار کر دیتا ہے تو دوسری طرف پرکاش کا کردار ہے۔وہ سکّو کے سارے عیبوں کا پتہ ہونے کے باوجود اس سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔محبّت اور جنس کے یہ دو متضاد پہلو ناول کو بہت دلچسپ بناتے ہیں۔

اس ناول میں ہمیں سکو کا کردار بڑی کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔جب سکّو کو پتہ چلتا ہے کہ وِنے اس کو گالیاں دے رہا تھا تو وہ وِنے سے شادی کے لیے پوچھتی ہے اور جب وِنے شادی سے انکار کرتا ہے تو کہتی ہے:

''تو میرے کو ایسا دیکھتا جیسے۔۔۔۔جیسے میں رستہ اوپر پڑیلی بریانی ہوں۔پوڑے کی بریانی۔۔۔ تھوڑی کوئی کھایا ۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔پھر پھینک دیا۔۔۔۔ہے نا؟''3

سکّو اس بات کو بخوبی جانتی ہے کہ یہ لوگ اسے صرف ایک کھلونا سمجھتے ہیں۔ان کی نظروں میں سکّو بس ایک دل بہلانے کی چیز ہے۔جب ڈھونڈو،سکّو اور پرکاش کی شادی کی بات کرتا ہے تو سکّو ناراضگی ظاہر کرتی ہے اور ڈھونڈو کے بار بار اصرار کرنے پر تیار نہیں ہوتی اور پرکاش سے کہتی ہے:

''پریم،شادی،ہوگا کیا اس سے۔شادی سے پہلے تو میرے یوون سے کھیلنا چاہتا ہے۔شادی کے بعد بھی کھیلے گا اور،بدلے میں مجھے کیا دے گا؟ بچّے بھوکے مرنے کو۔''4

یہاں سکّو کی شخصیت کا وہ روپ سامنے آتا ہے جس کی ایک عورت سے توقع نہیں کی جاسکتی۔عورت تو ایثار و قربانی کا نام ہے۔وہ شاید پرکاش کو اس لیے قبول نہیں کرتی کیوں کہ اسے اب کسی مرد پر اعتماد نہیں رہا اور ایسا اس لیے ہے کہ اس کے اپنے باپ نے بچپن

میں اسے اور اس کی ماں کو اکیلے مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

سکّو کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ اس کے پاس بھی پہننے کو اچھے کپڑے ہوں، کھانے کو اچھا کھانا ہو اور ڈھیر سارے پیسے ہوں تاکہ وہ بھی دوسروں کی طرح پڑھ لکھ سکے اور اپنی ضرورتیں پوری کر سکے اور یہ سب حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس صرف ایک راستہ تھا پیسے کمانے کا، وہ ہے جسم فروشی کا۔اس کے ذریعہ ہی وہ اپنی ساری خواہشیں پوری کرنا چاہتی ہے ۔ اسے بس اپنا آج سنوارنا ہے، اپنے مستقبل کی اسے کوئی فکر نہیں۔

ناول 'تین بتّی کے راما' میں موہن کا کردار سارے راماؤں سے مختلف ہے ۔ وہ سکّو کو اپنی بہن مانتا ہے اور اس سے ہمدردی رکھتا ہے۔ موہن، سکّو کو سمجھاتا ہے کہ وہ پرکاش سے شادی کر لے اور ایک اچھی زندگی گزارے لیکن سکّو منع کر دیتی ہے۔ موہن کو سکّو کی اس بات سے بہت دکھ پہنچتا ہے۔ ناول کے آخر میں ہمیں موہن کے رویہ میں ایک تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ باقی راماؤں کی طرح وہ بھی باتیں کرنے لگتا ہے ۔ ایک سادہ مزاج اور سلجھا ہوا کم عمر راما ناول کے آخر میں کچھ اس طرح کی باتیں کرتا ہے:

''تم نے دیکھا کیوں چیت نرائن، رومال باندھ لیتے اور لے جاتے اسے۔ موہن نے مشورہ دیا تو ڈھونڈو، ونے اور انو نے چونک کر اسے دیکھا۔''5

موہن کے رویہ میں یہ تبدیلی ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے اور سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ جو کم عمر نوجوان راما کل تک ایسی باتوں پر جھینپ جاتا تھا اور سکّو کی برائی سن کر ناراضگی ظاہر کرتا تھا آج وہ باقیوں کی طرح باتیں کر رہا ہے۔ اس ناول کو پڑھ کر قاری چونک جاتا ہے کہ آخر کسی کے رویہ میں اس قدر تبدیلی کیسے آسکتی ہے۔

جب ہم ناول 'تین بتّی کے راما' کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اس ناول میں مصنف نے اپنے گہرے مشاہدے اور باریک بینی کا ثبوت پیش کیا ہے ۔ علی امام نقوی کا تعلق ممبئی سے رہا اور انھوں نے اپنی ساری زندگی ممبئی میں ہی گزاری ہے۔ ممبئی کے ماحول اور وہاں کے لوگوں سے ان کے تعلقات رہے اور انھوں نے وہاں کی عوامی زندگی کو بہت ہی قریب سے دیکھا تھا۔ جو کچھ انھوں نے دیکھا اس کو انھوں نے اپنے ناول میں بخوبی پیش کر دیا ہے۔ علی امام نقوی اس ناول کو لکھنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں رفیق جعفر اس سلسلے میں اپنے مضمون میں اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''تین بتّی کے راما'' کی کہانی مہانگروں کی زندگی کی حقیقتوں کے ایک پہلو کی بھرپور عکاسی کرتی ہے یہ جس طبقے اور جس ماحول کی کہانی ہے اسے قریب سے دیکھے پرکھے اور بھوگے بغیر ایسی کہانی لکھی نہیں جا سکتی ۔ اس کے لیے تجربے کی نہ سہی بہت ہی گہرے مشاہدے کی ضرورت ہے۔ میرے خیال سے مصنف اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔''6

ناول 'تین بتّی کے راما' کا پلاٹ مربوط اور گٹھا ہوا ہے۔ اس میں ایک کے بعد دوسرے واقعات فطری ترتیب کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں ۔ کہانی کا آغاز تین بتّی کے چوراہے سے ہوتا ہے جہاں راما روز شام میں آکر بیٹھتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں ۔ وہ لوگ وہاں سکّو، راماؤں اور سیٹھ۔سٹھانیوں کے گھریلو مسائل اور ان کی نجی زندگی پر بھی تبادلۂ خیال کرتے ہیں ۔ جس سے ان کی زندگی کے معمولات اور روزمرہ کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے ۔ اس ناول کا کینوس بڑا نہیں ہے ۔ کہانی تین بتّی کے چوراہے اور سیٹھوں کے گھروں میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں مصنف نے آس پاس کے ماحول اور جزئیات کا ایک ہلکا سا نقشہ کھینچا ہے۔ جس سے جگہ اور مقامات کے بارے میں معلومات ملتی ہے اور ساتھ ہی کرداروں کے اعمال کے ذریعہ ان کی شخصیت اور وہاں کے ماحول کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

علی امام نقوی نے اس ناول میں جو کردار پیش کیے ہیں وہ دو طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ایک متمول گھرانے سے اور دوسرے نچلے متوسط طبقے سے۔ مصنف نے اپنی کہانیوں میں وہی کردار پیش کیے ہیں جو انھوں نے اپنے آس پاس دیکھے ہیں اور جن کے درمیان زندگی گزاری ہے۔ شمس الحق عثمانی اپنے مضمون میں علی امام

نقوی کے متعلق لکھتے ہیں:

''علی امام نقوی کا شمار 70 کی دہائی کے ان قلم کاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے فکشن میں بمبئی کی نمائندگی کی۔ پیشے سے ڈرائیور علی امام نے زندگی کو جتنے قریب سے دیکھا، اپنے افسانے اور ناولوں میں اتنی ہی باریکی سے بیان بھی کر دیا۔ بمبئی کی سڑکوں پر زندگی گزارنے والوں، نچلے طبقے اور عام انسان ان کے افسانے اور ناولوں کے اہم کردار ہوا کرتے تھے۔''7

ناول 'تین بتّی کے راما' میں کہانی غائب راوی کے ذریعہ صیغہ ماضی میں شروع ہوتی ہے اور مکالموں کے ذریعہ کہانی آگے بڑھتی ہے۔ اس ناول میں جو چھوٹے چھوٹے مکالمے کرداروں کی زبان سے ادا کرائیں گئے ہیں وہ گہری معنویت لیے ہوئے ہیں۔ اندازِ بیان طنزیہ ہے۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے ہمیں طنز کے نشتر چبھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مصنف نے اس ناول میں 'شعور کی رو' کی تکنیک کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ فلیش بیک اور خود کلامی کے ذریعہ ماضی کے پردوں میں جھانکنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ناول 'تین بتّی کے راما' میں مصنف نے ممبئی کی خاص عوامی زبان کا استعمال کر کے اس ناول کو مزید دلچسپ اور فطری بنا دیا ہے۔ ناول میں کرداروں کی زبان سے وہی جملے ادا کرائے گئے ہیں جو وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بولتے ہیں۔ اس ناول میں ہندی اور انگریزی الفاظ کا بھی بکثرت استعمال ہوا ہے۔ کردار اپنے خاص لہجے اور زبان میں محاورے اور روزمرہ کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ناول کی زبان اور اسلوب کے متعلق ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی لکھتے ہیں:

''علی امام نقوی نے ایک فطری اور حقیقی نقطۂ نظر اپناتے ہوئے نفیس اور ثقہ اسلوب بیان کے بجائے کرداروں کے منھ میں ان کی اپنی زبان ڈالی اور اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنا کر ناول میں علاقائی زبان کے استعمال کو تقویت بخشا۔''8

ناول 'تین بتّی کے راما' اپنے موضوع، اسلوب اور زبان کے اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔ علی امام نے اس ناول میں ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جس پر لکھنے کے لیے گہرے مشاہدے اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے ایک ایسی زبان کا استعمال کیا ہے جو ایک خاص طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس ناول کی زبان نے اسے دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ ناول اپنے موضوع کی وجہ سے اردو ادب میں ایک منفرد مقام بنانے میں کامیاب رہا ہے اور آج بھی اردو ادب میں اپنے مخصوص موضوع اور اسلوب کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ ناول 'تین بتّی کے راما' کے متعلق شمس الحق عثمانی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''علی امام نقوی کا 'تین بتّی کے راما' کئی لحاظ سے پرکشش ناول ہے: اس کے کرداروں میں کشش ہے۔۔۔ واقعات میں کشش ہے۔۔۔۔ ماحول میں۔۔۔ مکالموں میں۔۔۔ پلاٹ اور بیان میں بھی۔۔۔۔ جائے وقوع (بمبئی کا علاقہ ،تین بتّی) بھی اس کی کشش ہے۔۔۔ وہ ظاہری سرد مہری اور بہ ظاہر معروضی رویہ بھی اس کی کشش ہیں جو دراصل گہری فنکارانہ وابستگی سے جنمے ہیں۔''9

حواشی:

1 ہمعصر اردو ناولوں کا اجمالی جائزہ از ڈاکٹر محمد شارب، 2022، ص:152
2 تین بتّی کے راما از علی امام نقوی، 1991، ص:145
3 ایضاً، ص:28
4 ایضاً، ص:100
5 ایضاً، ص:151
6 'تین بتّی کے راما' علی امام نقوی از رفیق جعفر، مشمولہ معاصر اردو ناول، 2001۔ ص:152
7 سہ ماہی نیا ورق 56، 2020-2021، ص:66
8 'معاصر اردو ناول کے اسالیب' از شہاب ظفر اعظمی، مشمولہ ہمعصر اردو ناول ایک مطالعہ، 2007، ص:99
9 سہ ماہی نیا ورق 56، 2020-2021، ص:66

Nuzhat Fatma
Research Scholar, Department of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh, 202002 (U.P)
Email :nuzhatfatma2403@gmail.com

جہانِ نسواں

منیرہ اختر

ایران اور ہندوستان میں ناول نگاری کا آغاز و ارتقا

ایران اور ہندوستان میں ناول نگاری کا ظہور محض ایک ادبی تجربہ نہیں بلکہ گہرے سماجی، سیاسی اور تہذیبی تغیرات کا نتیجہ تھا۔ دونوں ملکوں میں ناول ایک ایسے دور میں سامنے آیا جب معاشرہ داخلی بحرانوں اور خارجی اثرات سے دوچار تھا۔ ایران میں تحریکِ مشروطہ نے فکری بیداری کو جنم دیا، جب کہ ہندوستان میں برطانوی استعمار اور جدید تعلیمی نظام نے ادبی روایت کو نئی جہت عطا کی۔

یہ مقالہ ایران اور ہندوستان میں ناول کے آغاز، اس کے تاریخی پس منظر، فکری محرکات، موضوعاتی جہات اور فنی ارتقاء کا تقابلی جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس مطالعے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اگرچہ دونوں ممالک میں ناول مغربی اثرات کے زیرِ اثر متعارف ہوا، تاہم ہر معاشرے نے اسے اپنے مخصوص تاریخی و ثقافتی تناظر میں ڈھال کر انفرادی شناخت عطا کی۔

الفاظ: ناول، ایران، ہندوستان، مشروطہ تحریک، نوآبادیات، سماجی اصلاح، تقابلی ادب

جدید ناول کو عموماً یورپی ادبی روایت کی پیداوار قرار دیا جاتا ہے، لیکن انیسویں اور بیسویں صدی میں یہ صنف محض جغرافیائی حدود تک محدود نہ رہی بلکہ مختلف تہذیبوں میں منتقل ہو کر نئی شناخت اختیار کرتی گئی۔ اس عمل کو تقابلی ادب کے جدید نظریات میں منتقل شدہ صنف (Transferred Genre) کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جہاں ایک ادبی قالب نئے سماجی و تاریخی تناظر میں داخل ہو کر اپنی ہیئت اور معنویت میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔

ایران اور ہندوستان دونوں قدیم بیانیہ روایات کے حامل معاشرے ہیں۔ فارسی ادب میں داستان، مثنوی اور حکایات کی طویل روایت موجود تھی، جبکہ ہندوستانی ادب میں سنسکرت، فارسی، اردو اور بنگالی داستانی ادب کی مضبوط بنیادیں موجود تھیں۔ تاہم جدید معنوں میں ناول کا ظہور دونوں خطوں میں ایک ایسے عہد میں ہوا جب معاشرہ گہرے سیاسی اور فکری تغیرات سے گزر رہا تھا۔

ایران میں تحریکِ مشروطہ نے سیاسی استبداد کے خلاف شعور کو بیدار کیا اور فرد کو ایک نئے فکری بحران سے روشناس کرایا، جب کہ ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام اور جدید تعلیمی ڈھانچے نے سماجی اصلاح اور قومی بیداری کی تحریکوں کو جنم دیا۔ یوں ناول دونوں معاشروں میں محض ادبی تجربہ نہ رہا بلکہ سماجی تبدیلی کا فعال وسیلہ بن گیا۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جب ایران میں ناول فارسی زبان میں تشکیل پایا، جبکہ ہندوستان میں جدید ناول انگریزی،

اردو، بنگالی اور ہندی جیسی زبانوں میں فروغ پذیر ہوا، تو تقابل کی بنیاد کیا ہوگی؟ اس مقالے کا تقابلی زاویہ لسانی مماثلت پر نہیں بلکہ تہذیبی و تاریخی مماثلت پر قائم ہے۔ یہاں تقابل دو زبانوں کا نہیں بلکہ دو سماجی تجربات کا ہے۔ ایک داخلی سیاسی انقلاب اور دوسرا نوآبادیاتی جبر۔ دونوں معاشروں نے تقریباً ایک ہی تاریخی دور میں جدیدیت کے دباؤ کو محسوس کیا اور ناول کو بطور صنف اختیار کیا، اگرچہ اظہار کی لسانی صورتیں مختلف تھیں۔

تقابلی ادب کے نظریہ دانوں کے مطابق جب کوئی نئی صنف کسی معاشرے میں داخل ہوتی ہے تو وہ محض تقلیدی صورت میں باقی نہیں رہتی بلکہ مقامی فکری، سماجی اور ثقافتی عناصر کے ساتھ تعامل کرتے ہوئے نئی معنویت پیدا کرتی ہے۔ اسی تناظر میں ایرانی اور ہندوستانی ناول نگاری کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ دونوں پر مغربی ادبی اثرات کارفرما تھے، تاہم ان کی فکری سمتیں یکساں نہیں رہیں۔ ایرانی ناول نے داخلی بحران، وجودی تنہائی اور علامتی اظہار کو اپنی اساس بنایا، جب کہ ہندوستانی ناول نے سماجی حقیقت نگاری، طبقاتی کشمکش اور قومی شعور کو مرکزیت دی۔

ایران میں ناول نگاری کا ابتدائی مرحلہ

فارسی ادب میں داستان اور حکایت کی ایک طویل اور درخشاں روایت موجود تھی، جس میں حماسی مثنویاں، عشقیہ داستانیں اور عوامی قصے شامل تھے۔ تاہم جدید معنوں میں ناول کا تصور مغربی ادب کے زیرِ اثر وجود میں آیا۔

عہدِ مشروطہ (1285ھ ش) ایران کی فکری تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔ آزادیِ اظہار، قانون کی بالادستی اور عدلِ اجتماعی جیسے تصورات نے ادب کو نئی جہت عطا کی۔ اسی دور میں تخلیق ہونے والی تصانیف، مثلاً سیاحت نامۂ ابراہیم بیگ اور شمس و طغرا، اگرچہ مکمل فنی پختگی سے ہمکنار نہ تھیں، لیکن جدید ناول کی بنیاد رکھنے میں ان کا کردار نمایاں تھا۔

اس عہد کے ادیبوں کا بنیادی مقصد اصلاحِ معاشرہ اور سیاسی شعور کی بیداری تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں فنی نزاکت سے زیادہ فکری اور اخلاقی پیغام کو اہمیت دی گئی۔

ترجمے کا اثر اور فکری بیداری

یورپی ناولوں کے تراجم نے ایرانی قارئین کے ذوق کو یکسر بدل دیا۔ الکساندر دوما، ژول ورن اور وکٹر ہیوگو جیسے مغربی ناول نگاروں کی تخلیقات نے ایرانی اہلِ قلم کو اس نئی صنف کی وسعتوں سے روشناس کرایا۔

ترجمے کے اس عمل نے نہ صرف فنی تکنیکوں کو متعارف کرایا بلکہ سماجی حقیقت نگاری اور کردار نگاری کی نئی راہیں بھی کھول دیں۔ عورتوں کی سماجی حالت، طبقاتی تفاوت، بدعنوانی اور اخلاقی انحطاط جیسے موضوعات ناولوں کا مرکزی محور بننے لگے۔

ایران میں ناول نگاری کا باقاعدہ آغاز تحریکِ مشروطہ (1906) کے پس منظر میں ہوا۔ اس تحریک نے سیاسی استبداد کے خلاف شعور بیدار کیا اور ادیبوں کو سماجی اصلاح کی جانب مائل کیا۔

جدید فارسی ناول کی تشکیل

محمد علی جمال زادہ کو جدید فارسی افسانہ اور ناول نگاری کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ ان کا مجموعہ 'یکی بود یکی نبود' فارسی نثر میں سادگی، روانی اور عوامی اسلوب کے فروغ کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ انھوں نے زبان کو تصنع اور تکلف سے آزاد کر کے عوامی محاورے سے قریب تر کیا۔

ان کے بعد صادق ہدایت نے فارسی ناول کو فنی اور نفسیاتی گہرائی عطا کی۔ ان کا شہرۂ آفاق ناول "بوفِ کور" جدید فارسی ادب کا سنگِ میل ہے، جس میں وجودی اضطراب، تنہائی اور باطنی کرب کی عکاسی نہایت فنکارانہ انداز میں کی گئی ہے۔

اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بزرگ علوی، جلال آل احمد، سیمین دانشور اور محمود دولت آبادی نے سماجی حقیقت نگاری، دیہی زندگی اور طبقاتی کشمکش کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔

1340ھ ش کے بعد کا رجحان

چالیس کی دہائی کے بعد فارسی ناول میں تکنیکی تجربات کا رجحان بڑھا۔ غلام حسین ساعدی اور ہوشنگ گلشیری نے بیانیہ اسلوب،

داخلی مکالمے اور علامتی اظہار کو فروغ دیا۔

محمود دولت آبادی نے دیہی معاشرے کی زندگی کو بھرپور حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا، جب کہ احمد محمود اور دیگر ادیبوں نے شہری زندگی کے تضادات اور سیاسی کشمکش کو موضوع بنایا۔

اس دور کا ناول مغربی تکنیک سے استفادہ کرنے کے باوجود ایرانی تہذیب، تاریخ اور ثقافت سے گہرا رشتہ برقرار رکھتا ہے۔

ہندوستان میں ناول نگاری کا آغاز

ہندوستان میں جدید ناول نگاری کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی میں برطانوی استعمار کے زیرِ اثر ہوا۔ نوآبادیاتی نظام کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم کے فروغ، جدید طباعت کے ارتقا، اخبارات و رسائل کی اشاعت اور سماجی و اصلاحی تحریکوں نے ایک نئے ادبی شعور کو جنم دیا۔ اسی بدلتے ہوئے تہذیبی و فکری پس منظر میں ناول ایک مؤثر ادبی صنف کے طور پر ابھرا، جو محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ سماجی تنقید اور فکری مکالمے کا وسیلہ بھی تھا۔

ہندوستانی انگریزی ادب کا اولین ناول Rajmohan's Wife (1864) تسلیم کیا جاتا ہے، جو نوآبادیاتی عہد کی داخلی ساخت اور سماجی تضادات کی ابتدائی نمائندگی کرتا ہے۔ جسے بنکم چندرا چٹوپادھائے نے تحریر کیا۔ یہ ناول ہندوستانی معاشرے کے داخلی تضادات اور نوآبادیاتی عہد کی سماجی ساخت کی عکاسی کرتا ہے۔ بعد ازاں بنگالی، اردو اور ہندی زبانوں میں ناول نگاری نے تیزی سے ترقی کی اور مقامی سماجی مسائل کو ادبی اظہار کا موضوع بنایا۔

اردو اور ہندی ناول کی روایت میں پریم چند کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے دیہی زندگی، زرعی استحصال، طبقاتی ناہمواری اور ذات پات کے نظام کو حقیقت نگاری کے اسلوب میں پیش کیا۔ ان کا شہرۂ آفاق ناول گئو دان ہندوستانی سماجی ناول کی نمائندہ تخلیق سمجھا جاتا ہے، جس میں استحصالی معاشرتی ڈھانچے اور کسان کی المیہ زندگی کو نہایت گہرائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر ہندوستانی ناول کا بنیادی رجحان سماجی اصلاح، قومی شعور کی بیداری اور نوآبادیاتی جبر کے خلاف فکری مزاحمت رہا ہے۔ یہ صنف بتدریج محض بیانیہ کہانی سے آگے بڑھ کر تہذیبی شناخت، طبقاتی کشمکش اور جدیدیت کے سوالات کی عکاس بن گئی، جس نے ہندوستانی معاشرے کی فکری تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

تقابلی تجزیہ

ہندوستان اور ایران میں جدید ناول نگاری کا ارتقا اگرچہ تقریباً ایک ہی تاریخی عہد، یعنی انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگم، میں وقوع پذیر ہوا، تاہم دونوں معاشروں کے مخصوص سیاسی، تہذیبی اور فکری پس منظر نے اس صنف کو جداگانہ سمتیں عطا کیں۔ ہندوستان میں ناول نگاری براہِ راست برطانوی نوآبادیاتی اقتدار، انگریزی نظامِ تعلیم، جدید طباعت کے فروغ اور سماجی اصلاحی تحریکوں کے زیرِ اثر پروان چڑھی۔ اس ماحول میں ناول محض ادبی تفریح نہیں رہا بلکہ سماجی شعور کی بیداری اور قومی شناخت کی تشکیل کا مؤثر ذریعہ بن گیا۔

اس روایت میں پریم چند کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، جن کے ناول گئودان میں زرعی استحصال، طبقاتی ناہمواری، ذات پات کے نظام اور دیہی زندگی کی الم ناک حقیقتوں کو نہایت سادہ مگر گہرے بیانیے میں پیش کیا گیا ہے؛ یہاں فرد کی کہانی دراصل اجتماعی دکھ اور سماجی ناانصافی کی علامت بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس ایران میں ناول نگاری کا ظہور قاجاری عہد کی اصلاحی تحریکوں، مغربی افکار سے تدریجی آشنائی اور خصوصاً مشروطہ انقلاب کے سیاسی و فکری ماحول سے مربوط ہے، جہاں استبدادی نظام، مذہبی جمود اور تہذیبی بحران نے ادیبوں کو ایک نئے اظہار کی طرف مائل کیا۔ ایرانی ناول نے اگرچہ سماجی اور قومی موضوعات کو بھی برتا، تاہم اس کا غالب رجحان فرد کی داخلی دنیا، نفسیاتی پیچیدگیوں اور وجودی اضطراب کی عکاسی کی طرف زیادہ مائل رہا۔ جدید فارسی ناول کی نمایاں مثال The Blind Owl ہے، اس تخلیق میں بیانیہ تجریدی، علامتی اور نفسیاتی ہے اور یہاں سماجی مسئلہ براہِ راست اصلاحی نعرے کی صورت میں نہیں بلکہ فرد کے باطنی انتشار، تنہائی اور تہذیبی شکست کے احساس کے ذریعے سامنے آتا ہے۔ بعد کے دور میں Simin Daneshvar کے ناول Savushun میں قومی شناخت، سیاسی شعور اور سماجی تبدیلی

کا عنصر نسبتاً واضح ہو جاتا ہے، تاہم اس میں بھی علامتی اور نفسیاتی جہات برقرار رہتی ہیں۔ اس تقابل سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی ناول کا بنیادی مزاج اجتماعی اور اصلاحی ہے، جہاں ادیب معاشرتی ڈھانچے کی خامیوں کو نمایاں کر کے قاری کو بیدار کرنا چاہتا ہے، جبکہ ایرانی ناول میں انفرادی تجربہ، داخلی کرب اور وجودی سوالات کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، گویا وہاں سماجی بحران فرد کے باطن میں منعکس ہو کر ایک علامتی اور فکری پیچیدگی اختیار کر لیتا ہے۔ ہندوستانی روایت میں حقیقت نگاری، بیانیہ سادگی اور دیہی و شہری معاشرت کی تفصیلی منظر کشی کو فوقیت حاصل ہے، جب کہ ایرانی روایت میں تجریدیت، علامت نگاری اور نفسیاتی تحلیل نمایاں ہے۔ مزید برآں ہندوستانی ناول براہِ راست نوآبادیاتی جبر اور قومی آزادی کی جدوجہد سے مربوط رہا، اس لیے اس میں مزاحمتی اور اصلاحی لہجہ زیادہ واضح ہے، جب کہ ایران میں استبداد اور تہذیبی بحران کے تجربے نے ادیب کو زیادہ داخلی اور فلسفیانہ انداز اپنانے پر آمادہ کیا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ دونوں ممالک میں ناول نگاری جدید شعور اور مغربی ادبی اثرات کی پیداوار ہونے کے باوجود اپنے اپنے معاشرتی سیاق کے مطابق مختلف جہات اختیار کرتی ہے: ہندوستان میں یہ صنف سماجی حقیقت نگاری اور قومی بیداری کی ترجمان بن کر ابھرتی ہے، جبکہ ایران میں یہ وجودی کرب، نفسیاتی تجزیے اور تہذیبی بے چینی کی علامت بن جاتی ہے۔ تاہم دونوں روایات میں ایک قدرِ مشترک بھی پائی جاتی ہے کہ ناول کو محض قصہ گوئی نہیں بلکہ فکری و تہذیبی مکالمے کا وسیلہ سمجھا گیا، اور اسی بنا پر یہ صنف دونوں معاشروں میں جدید ادبی اظہار کا بنیادی ستون قرار پاتی ہے۔

مجموعی طور پر ایران اور ہندوستان میں ناول نگاری کا آغاز اگرچہ مغربی ادبی اثرات کے زیر اثر ہوا، لیکن دونوں معاشروں نے اس صنف کو محض مستعار قالب کے طور پر قبول نہیں کیا بلکہ اسے اپنی تاریخی، تہذیبی اور فکری ضروریات کے مطابق نئے معنی عطا کیے۔ ایران میں ناول نے سیاسی بیداری، تہذیبی بحران اور فرد کی داخلی کشمکش کو علامتی اور نفسیاتی پیرائے میں پیش کر کے ایک گہری وجودی روایت کو جنم دیا، جب کہ ہندوستان میں ناول سماجی حقیقت نگاری، قومی شعور اور اصلاحِ معاشرہ کا مؤثر ذریعہ بن کر ابھرا۔

یوں دونوں روایات اس امر کی شاہد ہیں کہ ناول صرف ایک بیانیہ صنف نہیں بلکہ اجتماعی شعور کی تشکیل، تاریخی تجربے کی تعبیر اور تہذیبی شناخت کی بازیافت کا طاقتور وسیلہ ہے۔ تقابلی تناظر میں دیکھا جائے تو ایران اور ہندوستان کی ناول نگاری یہ واضح کرتی ہے کہ جب کوئی ادبی صنف ایک تہذیب سے دوسری تہذیب میں منتقل ہوتی ہے تو وہ محض شکل نہیں بدلتی بلکہ نئے سماجی سیاق میں نئے فکری امکانات پیدا کرتی ہے۔ یہی عمل ناول کو ایک زندہ، متحرک اور ہمہ جہت ادبی اظہار بناتا ہے، جو معاشرتی تبدیلی اور فکری ارتقا کا آئینہ دار بھی ہے اور محرک بھی۔

منابع

طالبوف، عبدالرحیم۔ (1895)۔ کتابِ احمد۔ استنبول۔

جمال زادہ، محمد علی۔ (1921)۔ یکی بود، یکی نبود۔ تہران۔

ہدایت، صادق۔ (1937)۔ بوفِ کور۔ تہران۔

علوی، بزرگ۔ (1952)۔ چشم ہایش۔ تہران۔

دانشور، سیمین۔ (1969)۔ سووشون۔ تہران۔

دولت آبادی، محمود۔ (1984)۔ کلیدر۔ تہران۔

نکم چندر چٹرجی۔ (1864)۔ راج موہن کی بیوی۔ کلکتہ۔

نکم چندر چٹرجی۔ (1882)۔ آنند مٹھ۔ کلکتہ۔

ٹیگور، رابندراتھ۔ (1916ء)۔ گھرے بائیرے (گھر اور دنیا)۔ کلکتہ

پریم چند۔ (1936)۔ گودان۔ الٰہ آباد۔

ملک راج آنند۔ (1935)۔ اَن ٹچیبل (اچھوت)۔ لندن۔

آر۔ کے۔ نارائن۔ (1935)۔ سوامی اینڈ فرینڈز۔ لندن۔

قرۃ العین حیدر۔ (1959)۔ آگ کا دریا۔ کراچی۔

□□□

Muneera Akhter
Habba Khatoon girls hostel
Room no S-28
Research Scholar
Department of Persian
University of kashmir
Hazratbal, Srinagar 190006 (J & K)

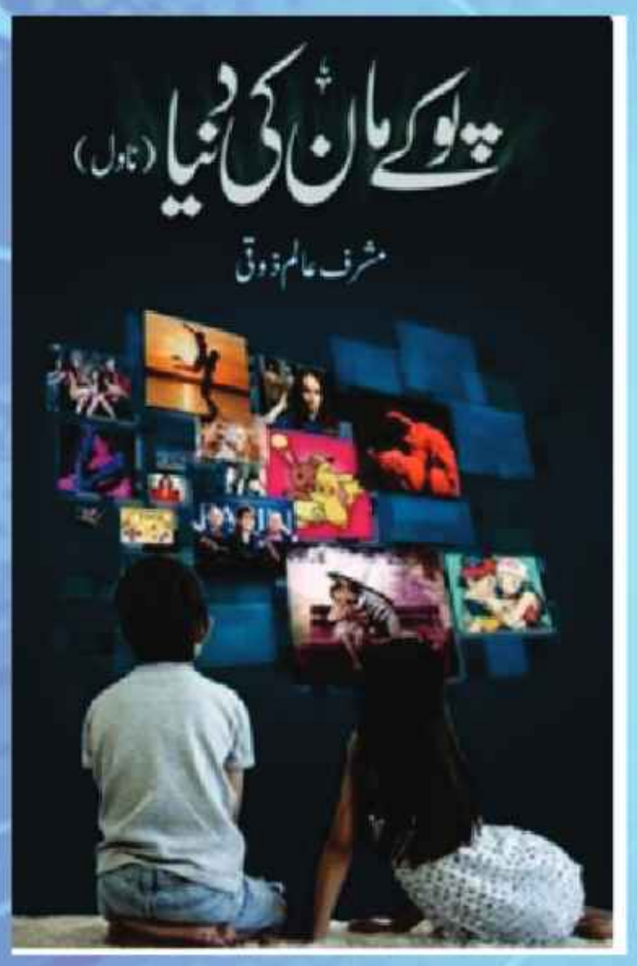

'پوکے مان کی دنیا' عصری آشوب اور ورچوئل ریئلٹی کا بیانیہ

صوفیہ پروین

جب بچپن اسکرین کی چمک میں گم ہو جائے ،حقیقت اور فریب کی سرحدیں دھندلا جائیں،تو ایسے میں ناول 'پوکے مان کی دنیا'ایک آئینہ بن کر ہمارے معاشرے کی اصل تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

عصر حاضر میں ڈیجیٹل تہذیب نے بچوں کے کھیل کے میدان تخیلی اور نفسیاتی جہان کو جس شدت سے متاثر کیا ہے، وہ محض تفریح یا ٹیکنالوجی کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک گہرا سماجی اور تہذیبی بحران ہے،'پوکے مان کی دنیا'، اسی بحران کی علامتی تعبیر ہے، جہاں ورچوئل کائنات بچوں کے معصوم ذہن کو مسحور کر کے انھیں ایک ایسے فریب نظر میں مبتلا کر دیتی ہے جو بہ ظاہر کھیل اور معصومیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے مگر درحقیقت ان کی شناخت ،اقدار اور نفسیاتی توازن کو متاثر کرتا ہے۔یہی وہ نکتہ ہے جو عالمی سطح پر بھی زیر بحث آیا،جس کے نتیجے میں مارک زکر برگ کو امریکی سینیٹ میں بچوں کی آن لائن حفاظت کے حوالے سے جواب دہ ہونا پڑا اور انھوں نے متاثرہ خاندانوں سے اعلانیہ معذرت کی۔

یہ واقعہ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ ورچوئل دنیا اب محض ایک تخیلی فضا نہیں رہی بلکہ ایک ایسی طاقت بن چکی ہے جو حقیقی زندگیوں کو تشکیل بھی دے رہی ہے اور بگاڑ بھی رہی ہے۔

ناول میں پیش کی گئی ڈیجیٹل کشش اور اس میں بچوں کی اندھا دھند شمولیت دراصل اسی عالمی مسئلے کی ادبی صورت گری ہے،جس میں بچے کھو جاتے ہیں اور آج کل جس طرح سوشل میڈیا پلیٹ فارمس بچوں کی نفسیات پر اثر انداز ہو رہے ہیں ،اسی طرح ناول میں ورچوئل گیم کی دنیا ایک متوازی حقیقت تخلیق کرتی ہے، جہاں بچے حقیقی رشتوں اور اخلاقی ذمہ داریوں سے کٹ کر ایک مصنوعی مسرت کے اسیر ہو جاتے ہیں۔

ناول اور یہ عالمی واقعہ باہم مل کر اس سوال کو جنم دیتے ہیں کہ کیا ہم ترقی کی دوڑ میں اپنی آئندہ نسل کی معصومیت اور ذہنی صحت کو داؤ پر لگا رہے ہیں؟اس تناظر میں' پوکے مان کی دنیا' محض بچوں کا ناول نہیں بلکہ ڈیجیٹل عہد کی تہذیبی تنقید ہے، جو ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ورچوئل تفریح اور حقیقی تربیت کے درمیان توازن کیسے قائم کیا جائے؟

اردو ادب میں جہاں ماضی کے موضوعات غالب رہے ہیں، وہاں' پوکے مان کی دنیا' ایک نیا زاویہ اختیار کرتا ہے۔یہ ناول محض ایک کہانی نہیں بلکہ موجودہ سماج پر ایک سنجیدہ سوال ہے، جس میں مصنف نے جہاں نو جوان نسل کی داخلی کشمکش ،والدین کی ذمہ داریوں کو نمایاں کیا ہے، وہیں ان تمام حقائق کو بھی عیاں کیا ہے جو نوجوان نسل کی بگاڑ کی وجہ ہے۔

اردو ناول کی روایت میں مشرف عالم ذوقی (1962 تا 2021)

ایک آواز کے طور پر ابھرتے ہیں ،ذوقی اردو ادب کے وہ تخلیق کار ہیں جنھوں نے مابعد جدیدیت کے دور میں اردو ناول کو ایک نیا آہنگ عطا کیا۔ان کے ناولوں میں عقاب کی آنکھیں، نیلام گھر ،شہر چپ ہے ،ذبح ،مسلمان ،بیان، پروفیسر ایس کی عجیب داستان، لے سانس بھی آہستہ، آتش رفتہ کا سراغ، نالۂ شب گیر اور مرگ انبوہ جیسے شاہکار ناول شامل ہیں لیکن 'پوکے مان کی دنیا' ان کی فنی پختگی اور عصری شعور کا نقطۂ عروج ہے۔ یہ ناول اس وقت منظر عام پر آیا جب دنیا گلوبلائزیشن کے اثرات سے گزر کر ڈیجیٹل کالونائزیشن کے دور میں داخل ہو رہی تھی، ذوقی نے محسوس کر لیا تھا کہ اب انسان کی جنگ سرحدوں پر نہیں بلکہ اس کے موبائل کی اسکرین اور ذہن کے اندر لڑی جا رہی ہے۔

ناول کا عنوان ایک جاپانی اینیمیشن اور ویڈیو گیم پوکے مان سے مستعار ہے ذوقی نے اسے ایک گہری علامت کے طور پر استعمال کیا ہے

تلاش کی ہوس: جس طرح گیم میں کھلاڑی پوکے مان کو پکڑنے کے لیے مارا مارا پھرتا ہے، اسی طرح جدید معاشرے کا انسان مادی اشیاء، عہدوں اور مصنوعی خوشیوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔

غیر مرئی گرفت: پوکے مان ایک ایسی مخلوق ہے جو نظر تو آتی ہے مگر حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں، ذوقی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم جس دنیا کو حقیقت سمجھ رہے ہیں وہ دراصل سچ ہے ہی نہیں ۔اس ناول کے تعلق سے سید عقیل رضوی لکھتے ہیں:

'ناول پوکے مان کی دنیا' موضوع میں ناول نگار مشرف عالم ذوقی نے نئی نسل کی دلچسپیوں میں سے ایک طریق زندگی پر بڑا اچھا مسئلہ اکٹھا کر دیا ہے اور نئے سماجی برتاؤ کی پیش کش بڑے اچھے اور تفتیش طلب انداز میں کی ہے اور دوستووسکی کا مشہور جملہ بھی ابتدا میں لکھ دیا ہے۔' بچے_ہاں مجھے لگتا ہے، بچوں کے بارے میں سوچنا ضروری ہے''۔1

336 صفحات پر مشتمل یہ ناول بدلتی ہوئی تہذیب اور جنریشن گیپ کی تصویر کشی کرتا ہے۔اس موضوع کو ذوقی نے کمال مہارت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ناول میں ذوقی نے دکھایا ہے کہ کس طرح بازار نے انسان کو ایک پروڈکٹ میں تبدیل کر دیا ہے؟ ہر چیز فروخت کے لیے ہے، خواہ وہ جذبات ہوں، رشتے ہوں یا نظریہ۔

ناول کی کہانی 12 سال کے دو معصوم بچوں کے گرد گھومتی ہے جو کھیل کھیل میں جنسی حدیں پار کر جاتے ہیں۔پوکے مان کے ذریعے ذوقی ان تمام حقائق کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو نوجوان نسل کی بگڑنے کی وجوہات ہیں۔

عصر حاضر میں انٹرنیٹ، کمپوٹر، ویڈیو گیمس، کارٹون اور جنک فوڈ جن کا ہماری مقامیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے ہمارے رویوں پر نہ صرف اثر انداز ہوئے ہیں بلکہ اپنے واضح نقوش بھی مرتب کیے ہیں۔

دنیا نے جب گلوبل ویلج کی شکل اختیار کی تو جہاں اس کے فائدے سامنے آئے، تو وہیں نقصان بھی عام انسان کے حصے میں آئے۔

اس تعلق سے ذوقی لکھتے ہیں:

''نئی ٹکنالوجی آپ پر دباؤ بڑھا رہی ہے، کبھی کبھی آپ غصے میں اپنا بلڈ پریشر بڑھا لیتے ہیں دنیا بھر کی بیماریوں اور ہائپر ٹینشن کا شکار ہو جاتے ہیں، کسی نے کہا تھا، نئی ٹکنالوجی نے آپ کو کیا دیا ہے؟ جواب تھا بھیانک اور نئی بیماری، اب کے بچے اتنی تیز اڑ رہے ہیں کہ ہماری پکڑ میں ہی نہیں آسکتے ۔نئی ٹکنالوجی صرف نئی اور بھیانک بیماریاں ہی دے سکتی ہے اور ہمیں ایسی نفسیات میں مبتلا کر سکتی ہے جس کا ہمارے پاس کوئی حل نہیں۔''2

جدید ٹکنالوجی نے انسان کو پوری دنیا سے تو جوڑ دیا ہے لیکن اسے اپنے گھر اور اپنی ذات سے بیگانہ کر دیا ہے 'پوکے مان کی دنیا' کا انسان ہجوم میں رہ کر بھی تنہا ہے، وہ اکثر انٹرنیٹ کے سگنلز میں زندگی ڈھونڈ رہا ہے، جب کہ اس کی حقیقی زندگی بنجر ہوتی جا رہی ہے۔اس سلسلے میں سنیل کمار لکھتے ہیں:

''دراصل مجھے پتہ بھی نہیں چلا اور بچے بڑے ہو گئے ۔میں بچوں کی پسند، ناپسند اور شوق کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان سکا___ بچے اڑتے رہے ____ زمانہ بدلتا رہا___

پرموشن فکر اور قانون کی موٹی موٹی کتابوں میں الجھا رہا۔
سوچتا ہوں کتنی دیر ہوگئی۔ بچے مجھ سے کتنی دور چلے گئے ''3

معاشرے کے اس بگاڑ کی ایک وجہ والدین کی لاپرواہی بھی ہے۔ والدین اپنی تیز دوڑتی زندگی میں بچوں کی طرف توجہ دینا بھول جاتے ہیں۔جس کے نتیجے میں نتن ،ریا اور روی جیسے بچے پیدا ہوتے ہیں ۔بچے کا ناپختہ ذہن ایک خالی سی ۔ڈی ۔کی طرح ہوتا ہے،جس میں آپ جو چاہے لوڈ کر سکتے ہیں۔

مغربی تہذیب نے اس سائبر کلچر کے بدلے ہم سے ہماری تہذیب چھین لی ،نئی نسل جو دراصل کمپیوٹر،انٹرنیٹ کیفے اور موبائل پر پروان چڑھ رہی ہے ،جن کی زندگی کا مقصد صرف عیش وعشرت اور جنسی لذت ہے۔

آج کل کے بچے الیکٹرانک میڈیا (ٹی وی،موبائل)اور سوشل میڈیا کی وجہ سے اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی باتیں جاننے لگے ہیں ،وہ چیزیں جس کا علم ان کو ایک عمر کے بعد ہونا تھا، وہ بچپن ہی میں ان کے سامنے آرہی ہے۔ کیونکہ انٹرنیٹ پر ایسی ویب سائٹس اور مواد موجود ہیں جو بچوں میں بے جا تجسس پیدا کرتا ہے۔ وہ نئے خیالات کے پیچھے بھاگتے ہوئے ایسے کام کر بیٹھتے ہیں،جن کا انجام بہت برا اور خوفناک ہوتا ہے۔

ذوقی نے ناول کے کردار نکھل کی زبانی عدالت میں بحث کے دوران اس بات کی طرف صاف طور پر اشارہ کیا ہے کہ روی اور سونالی نے جو کچھ بھی کیا ،اس میں قصوروار صرف روی کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا اور نہ ہی اسے بلاتکاری کا نام دینا درست ہے۔موجودہ دور میں بچوں کے لیے صرف یہ ایک نئے کھیل کی شروعات ہے ۔اس میں قصور کس کا ہے؟ یہ بھی ایک اہم سوال ہے اقتباس دیکھیں:

'' بلاتکار نہیں ایک کھیل می لارڈ بچوں کے بہت سارے کھیلوں میں شامل ہوا ایک کھیل ،جس کا تعلق جسم سے ہے اور بچے دوسرے کھیلوں میں اب اس کھیل کو فوقیت دینے لگے ہیں کیوں کہ اب یہ کھیل وہ گھر کے کسی بھی گوشے ،کونے میں کھیل سکتے ہیں اور ان کے لیے ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔وہ کہاں ہیں ! کہاں جا رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں''4

انٹرنیٹ کے دور میں پیدا ہونے والے بچوں کے مسائل بھی دوسرے ہیں۔ذوقی نے اس ناول میں اس بات پر زور دیا ہے کہ انسان صرف جسم نہیں بلکہ روح اور جذبات کا مجموعہ ہے۔جب نوجوانی کے آغاز میں فطری خواہشات بیدار ہوتی ہیں ،اس وقت اس کی صحیح رہنمائی نہ ہو تو یہی خواہشات بے راہ روی کا سبب بن سکتی ہے۔

یہ ناول موجودہ نسل،تہذیب اور معاشرے پر گہرا طنز ہے اور اس بات کی طرف واضح طور پر اشارہ ہے کہ تہذیبوں کا ملاپ ممکن نہیں۔

انسانی وجود کے پیدا ہوتے ہی اس کے ساتھ دو کیفیت پیدا ہوتی ہے،پہلی بھوک اور دوسری تجسس۔

ایک دوسرے کو مزید جاننے اور اپنے جذبات کے اظہار کی خواہش اس تجسس کو اور آگے بڑھاتی ہے،آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اتنی ترقی کے باوجود انسان خود کو تنہا پاتا ہے وہ اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر پاتا جس کی مثال ناول میں روی ہے جس کی باتوں میں اس کی تنہائی کا درد بولتا ہے۔

ذوقی نے ناول کے راوی سنیل کمار رائے کی زبانی بچوں کی نفسیات کی ترجمانی کی ہے کہ بچے آخر کیوں ان کے دیوانے ہیں،کیوں کہ انھوں نے رئیلٹی کو مردہ جان کر فنٹاسی میں جینا پسند کیا،مصنف نے مکمل تفصیل کو ناول کا حصہ بنایا اور آخر میں اس بات کا جواب بھی دیا ہے کہ آخر کیوں سونالی اور روی نے اتنی کم عمر میں جنسی دنیا میں قدم رکھ لیا۔

اس مکالمے کے دوران جئے چنگی رام اس نئی نوجوان نسل کے خیالات کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ نسل ایک جیسا سوچتی ہے صرف کامیاب ہونا چاہتی ہے اپنے حریف کو زیر کرنا ہی اس کا مقصد ہے ان نوجوان نسل کے خیالات کس حد تک خوفناک ہوتے جا رہے ہیں اس کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ناول میں ایسے تلخ جملوں کی بھرمار نظر آتی ہے،جس میں ذوقی نے کرداروں کے ذریعے معاشرے میں پائے جانے والے بگاڑ پر غصے کا اظہار کیا ہے۔

پوکے مان دراصل بچوں کے کارناموں پر مشتمل جاپانی لوک کتھاؤ سے لیے گئے کردار ہیں، بچے خاص طور سے ان کے ناموں اور کارناموں سے واقفیت رکھتے ہیں۔

ٹیلی ویژن پر تقریباً ایک سو پچاس پوکے مان دکھائے جاتے ہیں جب کہ ایک سو اکیاون واں پوکے مان ذوقی نے پیش کیا ہے ،جیسے ناول کے مطالعے کے بعد سمجھا جاسکتا ہے۔

یہ ناول کل 6 عنوان پر مشتمل ہیں:

1۔ایک سو اکیان واں پوکے مان

2۔ پوکے مان ٹریز

3۔کھو گیا ہے ایش

4۔جنگلی پف

5۔Meowth (راکٹ ٹیم کا پوکے مان)

6۔استعفیٰ نامہ

'پوکے مان کی دنیا' ناول کا پلاٹ سادہ، چست، رواں اور براہ راست انداز پر مبنی ہے ،تاہم اس کی سادگی میں فکری گہرائی اور معنوی وسعت بھی پوری طرح موجود ہے۔مصنف نے غیر ضروری پیچیدگی، ثقیل الفاظ اور مبالغے سے گریز کرتے ہوئے ایک ایسا بیانیہ انداز اختیار کیا ہے جو قاری کے ذہن و دل پر یکساں اثر انداز ہوتا ہے۔زبان نہایت عام فہم ،مگر اس میں ادبی وقار اور سنجیدگی برقرار رکھی گئی ہے، جس کے باعث تحریر نہ تو محض سطحی محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی غیر ضروری مشکل۔اسلوب کی یہی خصوصیت ناول کو وسیع تر قارئین کے لیے قابل قبول اور مؤثر بناتی ہے۔

بیانیہ انداز میں واقعات کو تسلسل اور ربط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ،جس سے کہانی میں انتشار پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایک فطری بہاؤ قائم رہتا ہے۔ہر واقعہ اپنے پس منظر اور نتائج کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ قاری کو کسی قسم کی ذہنی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔واقعات کی ترتیب منطقی ہے اور کرداروں کے افعال وردعمل بھی حالات کے عین مطابق دکھائے گئے ہیں۔اس طرح پلاٹ میں وحدت اور ہم آہنگی برقرار رہتی ہے جو کسی بھی سنجیدہ ناول کی بنیادی شرط ہے۔

مکالمہ نگاری اس ناول کا ایک اہم فنی عنصر ہے۔مکالمے نہایت فطری ،موقع کی مناسبت سے اور کردار کی عمر و ذہنی سطح کے مطابق تحریر کیے گئے ہیں خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں کے مکالمے میں ان کی نفسیاتی کیفیت ،جذبات اتار چڑھاؤ اور ذہنی کشمکش پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔یہی مکالمے نہ صرف کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں بلکہ کرداروں کی باطنی دنیا کو بھی منکشف کرتے ہیں۔اس طرح مصنف نے خارجی واقعات کے ساتھ ساتھ داخلی کیفیات کو بھی متوازن انداز میں پیش کیا ہے۔

ناول میں جدید سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات کا استعمال بھی ملتا ہے ،جو عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔تاہم ان اصطلاحات کو اس قدر سلیقے اور سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ قاری اجنبیت یا بوجھ محسوس نہیں کرتا یہ امر مصنف کی فنی مہارت کا ثبوت ہے کہ وہ عصری موضوعات کو عام فہم زبان میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ معاشرتی مسائل، تہذیبی تبدیلیوں اور نسل نو کی فکری سمتوں کو بھی نہایت سنجیدگی سے موضوع بنایا گیا ہے۔

منظر نگاری مختصر مگر جامع ہے۔مصنف طویل اور غیر ضروری تفصیل میں جانے کے بجائے چند مؤثر جملوں کے ذریعے فضا قائم کر دیتا ہے، جس سے قاری بآسانی حالات کا تصور قائم کر لیتا ہے۔ اسلوب میں روانی ،جملوں میں اعتدال اور بیان میں توازن پایا جاتا ہے۔کہیں بھی غیر مربوط پن یا اسلوبیاتی کمزوری محسوس نہیں ہوتی۔ پوری تحریر آغاز سے انجام تک ایک فطری اور بیانیاتی ربط کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول کا اسلوب بے حد خوب صورت ہے۔مصنف نے اپنے موضوع کی نزاکت اور سنجیدگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے زبان و بیان کا ایسا معیار قائم کیا ہے جو نہ صرف ادبی سطح پر قابل قدر ہے بلکہ سماجی اور فطری اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے یہی اسلوب اس ناول کو محض ایک کہانی کے درجے سے بلند کر

کے ایک سنجیدہ فطری اور ادبی دستاویز بنا دیتا ہے۔

اس کہانی کا راوی سنیل کمار ہے۔ اسی کی زبانی کہانی راوی تک پہنچتی ہے، جس میں روی پوکے مان کا دیوانا ہے اور کھیل کھیل میں اس سے غلطی ہو جاتی ہے جسے بلاتکار کا نام دیا جاتا ہے، ناول کا مرکزی کردار سنیل کمار رائے روی کا جج بھی ہوتا ہے اس کیس کے لیے وہ بہت سوچتا ہے اور پھر ایک تاریخی فیصلہ سناتا ہے۔ جو اس ناول کو اور دلچسپ بنا دیتا ہے ساتھ ہی ساتھ اس کی اہمیت میں مزید اضافہ بھی کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"روی کنچن بے قصور ہے اور اس پورے معاملے کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ایک چھوٹے سے پوکے مان کی غلطی کو نظر انداز کرنے میں ہی ہم سب کی بھلائی ہے، لیکن اس کے باوجود کوئی نہ کوئی مجرم ضرور ہے اور جو مجرم ہے، اسے سخت سے سخت سزا تو ملنی ہی چاہئے۔ اس لیے... میں پورے ہوش وحواس میں یہ فیصلہ سناتا ہوں کہ تعزیرات ہند، دفعہ 302 کے تحت _ میں اس نئی ٹکنالوجی، ملٹی نیشنل کمپنیز، کنزیومر ورلڈ اور گلوبلائزیشن کو سزائے موت کا حکم دیتا ہوں ____ ہینگ ٹل ڈیتھ"5

سنیل کمار رائے نے زیادہ تر مکالمے خود سے ادا کیے ہیں۔ خود کلامی کو ذوقی نے اسلوب کا حصہ بنایا ہے۔ سنیل کمار یہ جاننا چاہتا تھا کہ ایسی کون سی وجوہات ہیں، جس کے باعث اس معصوم بچے نے کھیل کھیل میں اتنا بڑا قدم اٹھایا۔ وہ اس معاملے کی گہرائی تک جانا چاہتا تھا کیوں کہ وہ حالات کی سنگینی سے واقف تھا، یہ کیس صرف روی کنچن کا نہیں بلکہ اس کے پس پردہ وہ اپنے بچے نتن اور ریا کو بھی دیکھ رہا تھا، ہندوستان کے ہر بچے کے لیے وہ پریشانی محسوس کر رہا تھا اس کی وجہ یہ تھی کی وہ جج ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باپ بھی تھا۔ ایک ایسا باپ جس کی اولاد اپنے پر نکلنے کے بعد گھونسلا چھوڑ چکی تھی اور یہ غم میاں بیوی کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا:

"جب ہمیں اپنے کلچر، اپنی وراثت کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ کیا سچ میں عمر کے کسی لمحے، باتیں ہمیں پریشان کرتی ہیں کہ ہمارا کلچر ہم سے دور ہو رہا ہے ____ ایک سنسکرتی ہم سے روٹھ رہی ہے"6

اسنیہہ کا کردار ایک جاندار کردار ہے وہ نتن اور ریا کی ماں ہوتی ہے۔ وہ ایک ماں ہونے کے بعد بھی اپنے بچوں کو ہر طرح کی آزادی دیتی ہے تا کہ بچے اور ان کے درمیان کوئی گیپ محسوس نہ ہو۔ اس کا کردار مثبت ہے جو برا دیکھ کر بھی اچھے کی امید میں رہتی ہے لیکن اتنا کرنے کے بعد بھی ان کے بچے ان کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ شروع کے حصے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے بہت جذباتی نہیں ہے جیسے ایک ماں کو ہونا چاہیے لیکن ناول کا مکمل مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنیل کمار سے زیادہ حساس اور جذباتی ہے، اپنے بچوں کو لے کر جو اسے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔

"اسنیہہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی، پھر بھی ہمیں سوچنا تو ہوگا سنیل ۔سوچنا تو ہوگا۔ یہ معاملہ ریا کا ہے قبرستان کا نہیں۔ قدیم روحوں کا نہیں ہماری ریا کا ہے۔ وہ بن مانس، مجھے لگتا ہے وہ ریا کو تباہ کر رہا ہے۔ کوئی کسی کو تباہ نہیں کر رہا ہے اسنیہہ، ان دونوں نے اپنے لیے نئے راستے چنے ہیں۔ جو نئی تہذیب سے ہو کر گزرتا ہے۔ پھر بھی مجھے ڈر لگتا ہے۔ سوچو، کتنا اندھیرا ہے۔ اتنا بڑا کواٹر اور صرف ہم دو۔ پہلے دو دو بچوں کے بارے میں سوچ کر مطمئن ہو جایا کرتی تھی، مگر اب ہول آتا ہے۔ اپنے آپ کو پہلے کی طرح مصروف کر لو۔ بچوں نے اپنے آسمان چن لیے۔ کرسی سے اٹھتے ہوئے میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ اسنیہہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی، کتنی مدت کے بعد"7

جئے چنگی رام سونالی کا والد اور ذات کا دلت عمر 47 سال بچپن میں جب اس نے جگجیون رام کی سیاسی شہرت کو دیکھا جو کہ ذات کے دلت تھے تو اس کے دل میں بھی ویسا بننے کی خواہش جاگی۔ جگجیون بابو کے کہے ہوئے الفاظ میں اپنا مستقبل ڈھونڈتے ہوئے جئے چنگی رام بھی برابری کرنے کے لیے تعلیم کی طرف متوجہ ہوا تا کہ جگجیون رام جیسا

بن سکے۔اسے ہر جگہ ہتک کا احساس ہوتا،اسکول میں اسے ایسے سمجھا جاتا جیسے وہ چھوت کی بیماری ہو۔کم عمر میں ہی اس کی شادی ستمبرا سے کرادی جاتی مگر وہ اپنے خوابوں کو نہ بھول سکا اور وہ سب چھوڑ کر دہلی چلا گیا اور دہلی میں کامیاب ہونے کے بعد شوبھا سے شادی کر لی ہے لیکن شوبھا اس سے وفادار نہیں اور سونالی بھی اس سے محبت نہیں کرتی ۔ان تمام وجوہات کی بنیاد پر وہ اپنے کیے ہوئے پر بہت افسوس کرتا ہے اور جلد سے جلد اپنی بیوی ستمبرا اور بیٹی کو بلانا چاہتا ہے۔

اس کے علاوہ اس ناول میں کئی اور کردار ہیں ،جیسے پرما کر ،بورڈ میں شامل خاتون ریتا بھاوے،دیورت (روی کا والد)،شوبھا وغیرہ ذوقی نے کرداروں کو بہت خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے، جب قاری اس ناول کا مطالعہ کرتا ہے۔اس وقت یہ کردار اس کے سامنے چلتے پھرتے معلوم ہوتے ہیں اور قاری خود کو اس ناول کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔

منظر نگاری اور جذبات نگاری کو بھی بہت خوبصورتی سے ذوقی نے اس ناول میں جگہ دی ہے،گرچہ منظر نگاری کا استعمال کم نظر آتا ہے لیکن جتنا ہے وہ کمال ہے

''آسمان میں شام کی سیاہی پھیل چکی تھی دھند غائب تھی ۔

آسمان اپنے نیلے رنگ کے ساتھ کھلکھلا رہا تھا''8

ذوقی نے ناول میں مختصر اور جامع مکالمات کا سہارا لیا ہے مگر ناول کے آخری حصے میں فیصلے کو مختصر نہیں بیان کیا ہے بلکہ تفصیل سے ان تمام برائیوں کا پردہ چاک کیا ہے جو آہستہ آہستہ معاشرے میں جذب ہوتی جارہی ہیں۔

اس ناول میں ڈائری کی تکنیک کا بھی استعمال کیا گیا ہے اور انگریزی معنی خیز الفاظ کے استعمال سے ذوقی نے اسلوب میں نیا رنگ بھر دیا ہے۔

9"we are like this only"

بالآخر یہ کہا جا سکتا ہے کہ " پوکے مان کی دنیا" محض ایک تخیلی یا تفریحی بیانیہ نہیں بلکہ ڈیجیٹل عہد کے تہذیبی اور نفسیاتی بحران کا علامتی دستاویز ہے۔جب مارک زکر برگ جیسے عالمی ٹیکنالوجی رہنما کو بچوں کی آن لائن سلامتی کے مسئلہ پر عالمی سطح پر جواب دہ ہونا پڑتا ہے،تو یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ مسئلہ انفرادی یا مقامی نہیں بلکہ ایک عالمی اور ساختیاتی حقیقت بن چکا ہے۔ناول میں پیش کی گئی ورچوئل کشش بچوں کے ذہنی ساخت میں آنے والی تبدیلیاں اور حقیقی رشتوں سے ان کی بتدریج دوری اسی عالمی منظرنامے کی ادبی تشکیل ہے۔ یہ ناول ہمیں اس نکتے پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ ٹیکنالوجی کی ترقی اگر اخلاقی بصیرت اور تربیتی شعور سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ آنے والی نسلوں کے لیے سہولت سے زیادہ خطرہ بھی بن سکتی ہے۔ادب کا مقصد یہی ہے کہ وہ سماج کے باطن میں چھپی ہوئی صداؤں کو آشکار کرے،پوکے مان کی دنیا اسی معنویت کے ساتھ ہمارے عہد کی فکری تاریخ میں اپنا مقام متعین کرتا ہے اور ہمارے ذہن میں کئی سارے سوالات چھوڑ جاتا ہے۔

کتابیات

1 صغیر ،احمد ،اردو ناول کا تنقیدی جائزہ(1980 کے بعد)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،ص:165

https://www.bbc.com

https://youtube.com/shorts/5yYPdEKrskI?si=GAaSFb34T25WKqTw

2 ذوقی،مشرف عالم، پوکے مان کی دنیا،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی، ص:49

3 ایضاً ص76

4 ایضاً ص205

5 ایضاً ص330

6 ایضاً ص211

7 ایضاً ص213

8 ایضاً ص332

9 ایضاً ص327

❐❖❐

Sufiya Parveen
Research Scholer,JNU
Room Number 129,Lohit Hostel
JNU
Jawaharlal Nehru University,
New Delhi,110067

عنب شمیم

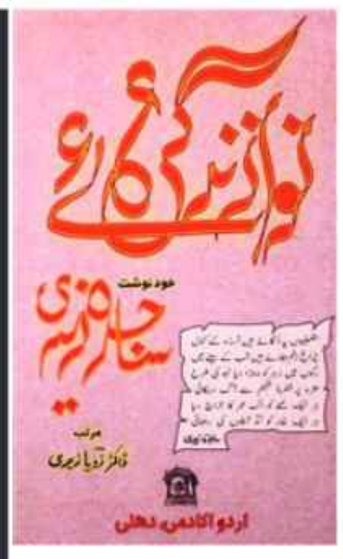

ساجدہ زیدی کی خودنوشت 'نوائے زندگی' کا تجزیاتی مطالعہ

ساجدہ زیدی کا شمار اردو ادب کی ان خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے ایک عہد کی تصویر کشی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے تنقیدی و تبصراتی مضامین کے ذریعے اردو ادب کے سرمائے میں اضافے کیا بلکہ شعر و سخن، تراجم اور خودنوشت کے ذریعے بھی اسے ثروت مند بنایا۔ ساجدہ زیدی کا تعلق ایک ایسے خانوادے سے ہے جس کا سلسلہ خواجہ الطاف حسین حالی تک پہنچتا ہے۔ ان کی پانچ بہنیں تھیں اور وہ اپنی بہنوں میں کئی اعتبار سے امتیازی شناخت رکھتی ہیں۔ ان کی پانچوں بہنیں (زاہدہ، ساجدہ، شاہدہ، صابرہ اور خدیجہ) علم و ادب سے آراستہ تھیں اور مختلف حوالوں سے جدید ادبی معاشرے کا حصہ رہی ہیں۔

ساجدہ زیدی کا مطالعہ کسی ایک زبان و ادب تک محدود نہیں تھا۔ بلکہ سماجیاتی علوم، نفسیات اور موازناتی مطالعے پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ انگریزی، فارسی اور دیگر زبانوں پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے ہندوستان سے لے کر بیرون ملک تک کے اسفار سے جو تجربات و مشاہدات حاصل کیے اسے اپنی خودنوشت کا حصہ بنایا ہے۔ ان کی زندگی خواتین کے لیے کئی اعتبار سے قابل تقلید اور سبق آموز ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف واقعات کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ خودنوشت میں پیش کیا ہے۔ یہ خودنوشت ان کے انتقال کے بعد صاحبزادی زویا زیدی نے ترتیب دی ہے، جسے اردو اکیڈمی دہلی نے سن 2012 میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہ خودنوشت ضخامت کے اعتبار سے ساڑھے چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے مشمولات مختلف انداز سے قارئین کو متاثر کرتے ہیں۔ زویا زیدی نے اس خودنوشت کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

نوائے زندگی کا پہلا باب، عہد طفلی، مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں، علی گڑھ ہجرت کے شب و روز، پانی پت، خواب پرواز نئی راہوں کی تلاش اور پانی پت، یہ 2004 ہے، اگر فردوس پر روئے زمیں ہست علی گڑھ ہاسٹل کا قیام فرسٹ، ہاسٹل کا قیام سیکنڈ، اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے، یہ داغ داغ اجالا، ہم کہ تاریک راہوں میں مارے گئے، جہد حیات کی ابتدا، ایک دور کا اختتام، میرے بچے بہنیں اور تلاش حق، کمیونسٹ پارٹی اور ہم، تعمیر خودی کر اثر آہ رسا دیکھ، سفر حیات، علی گڑھ یونیورسٹی میں تقرر، یہ بزم وفا پروانوں کی، میری شب گزاری کی محنت کشی میں، اسی روز شب میں الجھ کر نہ رہ جا، شہر نگاراں، روم اطالیہ کا دل جیسے عناوین پر مشتمل ہے۔

اسی طرح خودنوشت کا دوسرا باب، کہ جیسے تاریک شب کے دامن میں دست قدرت، ہمارا گھر، تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا، لندن کی زندگی، لندن سے واپسی پر اہم سروکار، علی گڑھ یونیورسٹی

کے شب و روز اور میرے سروکار، تیری سادگی سے جانا کہ نقش معتبر ہے، تمھارا پیکر کی حسن تشکیل ہے میری خوئے جستجو کا، مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں، آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے، عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام، بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند، سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند، وہ بھی ایک خاندان تھا، ہے الم کا صورت بھی جزو کتاب زندگی، ہمارے بچے بڑے ہو گئے، تنہائی کے شب و روز، اقداری تعلیم کا تصور، موج گل سے چراغاں تھی گزرگاہ خیال، اداس نسلیں، ایک یادگار سفر، سیر کہستاں، معاصر ادبی صورتحال اور میں، آزمائشوں کا دور، کچھ اہم واقعات، اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا ہے، مسلمانان ہند اپنی جمہوری حکومت میں، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے 2، میں شاید انفس و آفاق کے سرنہا میں خود بھی شامل ہوں، فنون لطیفہ کا ذوق، سفر زندگی کے لیے برگ و ساز۔۔ سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز، کچھ زمینی حقیقتیں کے ذیلی عناوین پر مشتمل ہے۔ آخر میں ڈاکٹر زویا زیدی کی ایک تحریر ''مجھے شاید ہمالہ کی فلک پیمائیاں آواز دیتی ہیں'' اور ساجدہ زیدی کی کچھ تصاویر بھی کتاب کا حصہ ہیں۔

خودنوشت کے آغاز میں 'کرتی ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو' کے عنوان سے ڈاکٹر زویا زیدی کی ایک تحریر شامل ہے۔ اسی طریقے سے 'حرف آغاز' کے عنوان سے پروفیسر ساجدہ زیدی کی بھی ایک تحریر کتاب کا حصہ ہے۔ خودنوشت کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساجدہ زیدی نے اس کی ترتیب کی پوری ذمہ داری اپنی زندگی میں ہی ادا کر دی تھی البتہ کچھ چیزیں باقی رہ گئی تھی جنھیں بعد میں زویا زیدی نے تکمیل تک پہنچایا۔ زویا زیدی کا بھی علم و ادب سے گہرا تعلق تھا اور انھوں نے اس کا اظہار اپنی تحریر میں کیا ہے۔

خودنوشت میں حرف آغاز کے تحت ساجدہ زیدی نے کئی اہم خیالات کا اظہار کیا ہے۔ خودنوشت کے حوالے سے ان کا ایک اقتباس بطور خاص اہمیت کا حامل ہے، جس میں وہ لکھتی ہیں:

ہر رائٹر کی تخلیق کا کوئی نہ کوئی مخصوص مخاطب بھی ہوتا ہے۔ اس روداد کا مخاطب میرے بچے اور ان کے بچے اور آئندہ نسلیں ہیں۔ کیوں ہیں میں نہیں جانتی۔ اگرچہ یہ عجیب سی حقیقت راستے میں حائل ہے کہ زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم۔ میں نے یہ سب اردو میں لکھا ہے اور میرے زیادہ تر بچوں اور ان کے بچوں کی پہلی زبان انگریزی ہے۔ شاید ان میں سے کوئی اعلیٰ سطح کی اردو سیکھ کر اس کا بزبان انگریزی ترجمہ کر لے۔

(نوائے زندگی، ساجدہ زیدی، ناشر: دہلی اردو اکادمی، سن 2012، ص 20)

''ساجدہ زیدی کی خود نوشت ایک ایسی خاتون کی خود نوشت ہے جو اپنے ساتھ اہل خانہ کی ترقی کی بھی خواہش رکھتی ہے۔ انھوں نے عہد طفلی سے لے کر تعلیم و تدریس اور خارجی ممالک کے اسفار تک کے جو مشاہدات درج کیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت میں والدین کے ساتھ بھنوں کا بھی اہم کردار ہے''

ساجدہ زیدی نے یہاں زبان کے حوالے سے جس خدشے کا اظہار کیا ہے وہ مبنی بر حقیقت بھی ہے اور غور و فکر کا مقام بھی۔ ان کے بچوں میں شاید ہی کوئی ہو جسے اردو زبان و ادب سے تعلق ہو۔ بیشتر کا تعلق انگریزی زبان و ادب سے ہے اور بیرون ملک اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سے ایک سوال یہ بھی قائم ہوتا ہے کہ ہماری آئندہ نسل اردو زبان و ادب کو کس طرح دیکھتی ہے۔

ساجدہ زیدی نے اپنی علمی و ادبی زندگی کو ثروت مند بنانے کے لیے مختلف دشواریوں کا سامنا کیا اور کئی ممالک کے بڑے شہروں میں رہ کر بھی سیکھنے کی کوششیں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس خودنوشت میں دنیا جہان کے تجربات بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ خودنوشت کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا شعور

مقامی نہیں بلکہ عالمی تھا۔ انھوں نے مختلف علوم وفنون کا مطالعہ کیا تھا اور اس کا عکس خودنوشت میں جابجا نظر آتا ہے۔

ساجدہ زیدی کی خودنوشت ایک ایسی خاتون کی خودنوشت ہے جو اپنے ساتھ اہل خانہ کی ترقی کی بھی خواہش رکھتی ہے۔ انھوں نے عہد طفلی سے لے کر تعلیم وتدریس اور خارجی ممالک کے اسفار تک کے جو مشاہدات درج کیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت میں والدین کے ساتھ بہنوں کا بھی اہم کردار ہے۔ میرٹھ، پنجاب، علی گڑھ، دہلی اور دیگر ہندوستانی شہران کی خودنوشت میں خاص طور سے اپنی ادبی صورت حال کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ کم عمری میں ہی ان کے والد کا انتقال تھا۔ والد کے انتقال نے تمام بہنوں کے دلوں پر گہرا اثر کیا۔ تمام بہنیں اس ناگہانی واقعے سے بیحد دلبرداشتہ ہوئیں۔ اس کا ذکر ساجدہ زیدی نے اپنی خودنوشت میں نہایت غم ناک طریقے سے کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

ہمارے بچپن پر اداسی ٹوٹ پڑی اماں کا عہد جوانی (اس وقت ان کی عمر 36 سال تھی) ویران ہوگیا۔ ان کا دل تو ویران ہوا ہی تھا اماں نے اپنی زندگی بھی ویران کر لی۔ سب زیورات، ناک کی لونگ اور انگلیوں کی انگشتریاں اتار پھینکیں، اس دن جو سر پر سفید دوپٹہ ڈالا اس کی طہارت میں زندگی بھر فرق نہ آیا۔ انھوں نے پھر کبھی بیل لگا سفید دوپٹا بھی نہیں اوڑھا۔ عیش وآرام کے تمام لوازمات سے نظریں پھیر لی۔ دن بھر سوگوار رہتیں اور بھائی ابا کی یاد میں نظم ونثر لکھتی رہتیں۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ چند مہینے کے اندر اندر انھوں نے بھائی ابا کے سوانح عمری قلم بند کر لی، جو اس شعر پر ختم ہوتی تھی:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
بوئے گل سیر نہ دیدم کی بہار آخر شد،

(نوائے زندگی، ساجدہ زیدی، ناشر: دہلی اردو اکادمی، سن 2012، ص 46)

شعر کی کیفیت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت ان کی والدہ پر کیا گزری تھی۔ والدہ کے ساتھ ان بہنوں نے بھی اس ناگہانی واقعے کو کس طرح برداشت کیا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس واقعے نے مختلف سطحوں پر تمام بہنوں کو متاثر کیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بہنوں کے سر سے تحفظ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

> احساس ذمہ داری پیدا ہونا تو اس المناک افتاد کا سب سے مثبت اظہار تھا لیکن اس کے علاوہ بہت کچھ اور ہوا۔ رنج وغم کا معاملہ تو الگ ہے لیکن بچپن میں اگر احساس محفوظیت میں دراڑ پڑ جائے، خصوصاً باپ کا سایہ سر سے اٹھ جائے تو انسانی سائکی بڑی دور تک مجروح ہوتی چلی جاتی ہے۔ زندگی کی دھوپ تیز تر ہو جاتی ہے۔ خود اعتمادی پر گہری ضرب پڑ جاتی ہے۔ احساس خودی، احساس قوت وسربلندی، احساس کامرانی و برتری، اگر انسان کامران اور برتر ہے تب بھی، سب خوفزدہ سے رہتے ہیں۔

(نوائے زندگی، ساجدہ زیدی، ناشر: دہلی اردو اکادمی، سن 2012، ص 50)

ساجدہ زیدی نے والد کے انتقال کے باوجود اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھا اور انھوں نے وہ سب حاصل کیا جس کی ایک باشعور خاتون کو تلاش ہوتی ہے۔ البتہ انھوں نے کسی مقام پر تکبر حاوی نہیں ہونے دیا اور نہ ہی بے جا نمائش میں گرفتار ہوئیں۔ انھوں نے ہمیشہ سادگی اور سچائی کو دامن گیر رکھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی مقام پر نہایت بے تکلفی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ ایک مقام پر لکھتی ہیں:

> اپنے تجربے کی بنا پر میں جانتی ہوں میں نے اپنی بساط بھر سب کچھ حاصل کیا۔ تہذیب وتمدن، علم، تخلیقی برتری، شہرت، عزت واحترام، اعلیٰ عہدے، شاعری، دانشوری، اعزاز، قابل فخر اولاد، مگر میں احساس برتری میں تو کیا مبتلا ہوتی کبھی فخر وغرور بھی محسوس نہیں کیا۔ خوبصورتی کی ہر چھوٹے بڑے نے ہمیشہ ستائش کی اور میں کبھی خود کو حسین نہیں سمجھ سکی۔ اور ہمیشہ یہ دیکھا کہ مجھ سے کم تر علم وعقل اور علمی وتخلیقی حسن و شخصی دلکشی کے مالک لوگ مجھ سے کہیں زیادہ خود اعتمادی،

خودستائی اور برتری کا بے دھڑک اظہار کرتے ہیں۔

(نوائے زندگی، ساجدہ زیدی، ناشر: دہلی اردو اکادمی، سن 2012، ص50)

یہاں پر ساجدہ زیدی نے جن اوصاف کا ذکر کیا ہے یہ وہی ہیں جو ایک بلند شخصیت کے اندر بھی لچک اور خوبی کی علامت تصور کیے جاتے ہیں۔ اگر یہ خوبیاں انسان کے اندر موجود ہوتی ہیں تو اس کی شخصیت گراں بار ہو جاتی ہے، ورنہ اس سے کسی قسم کی سنجیدگی کا مطالبہ بے سود ہوتا ہے۔

ساجدہ زیدی نے اپنی خود نوشت میں مختلف شہروں کے حوالے سے جس قسم کے تجربات بیان کیے ہیں وہ ہر اعتبار سے غیر معمولی ہیں۔ انھوں نے پانی پت کے حوالے سے کئی اہم باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے کشمیر کے اپنے پہلے سفر کی داستان بھی نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ کشمیر میں انھوں نے مختلف باغات کی سیر کی اور ڈل جھیل کا بھی لطف لیا۔ اس سفر میں ان کے ہمراہ ان کے ماموجان بھی تھے جو مختلف مقامات پر ان کی رہنمائی کرتے رہے۔

ساجدہ زیدی نے اپنی خودنوشت میں مختلف شہروں کے حوالے سے جس قسم کے تجربات بیان کیے ہیں وہ ہر اعتبار سے غیر معمولی ہیں۔ انھوں نے پانی پت کے حوالے سے کئی اہم باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے کشمیر کے اپنے پہلے سفر کی داستان بھی نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ کشمیر میں انھوں نے مختلف باغات کی سیر کی اور ڈل جھیل کا بھی لطف لیا۔ اس سفر میں ان کے ہمراہ ان کے ماموجان بھی تھے جو مختلف مقامات پر ان کی رہنمائی کرتے رہے۔ اپنے اس خوبصورت تجربے کے متعلق وہ لکھتی ہیں:

ماموجان نے شالیمار باغ، نشاط باغ، نسیم باغ اور چشمہ شاہی کی سیر کرانے کا بھی اہتمام کیا۔ یہ سب مغل بادشاہوں کے بنوائے ہوئے باغات کسی نہ کسی چشمے کے دہانے پر اونچی پہاڑیوں پر واقع ہیں۔ ان قدرتی چشموں کو نہر و فواروں اور بارادریوں کی شکل میں تراش کر باغات بنائے گئے ہیں اور خوبصورت پھولوں اور روشوں سے ان کی تزئین کی گئی ہے۔ سب چشمے ڈل جھیل میں جا کر گرتے ہیں۔ سب باغات مغل بادشاہوں کے دلکش فن تعمیر، حسن پرستی اور حسن شناسی کی منھ بولتی تصویریں ہیں۔ نہریں، روشیں بارہ دریاں گل و گلزار ہر چشمے کا حصہ ہیں۔ چشمہ شاہی بڑا معجزاتی چشمہ ہے۔ اس کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی اتنا ہلکا ہے کہ ایک جگ بھر پی لیں پھر بھی اور پیتے رہنے کی خواہش رہتی ہے۔ یہ پانی پیتے ہی کھانا بالکل ہضم ہو جاتا ہے اور پھر بھوک لگنے لگتی ہے۔ پانی کیا قدرت کا کرشمہ ہے۔ کبھی کبھی ہم ڈل جھیل میں شکارے کے ذریعے کسی باغ میں جاتے۔ شکارے سرخ و سبز پردوں اور پھول دار گدوں سے سجی ہوئی آرام دہ آہستہ خرام، ایسی کشتیاں ہوتی ہیں جنھیں گدڑی پوش مانجھی چپو سے چلاتے ہیں۔ وہ اپنی اس غربت کے باوجود شکاروں کی نفاست میں فرق آنے نہیں دیتے۔ اور اپنے ہاؤس بوٹ کو جن میں بیڈ روم، ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم اور چھت پر برآمدہ سب کچھ ہوتا ہے۔ ریشمی پردوں اور آرام دہ بستروں سے لے کر جام و مینا تک ہر چیز سے مزین رکھتے ہیں۔ یہ تضاد ہماری دنیا میں عام ہے۔ مانجھی اپنے معیار میں کبھی فرق نہیں آنے دیتے۔ جھیل کے ان مکینوں کا روزگار یہی ہے۔

(نوائے زندگی، ساجدہ زیدی، ناشر: دہلی اردو اکادمی، سن 2012، ص90-91)

کشمیر کے حوالے سے انھوں نے جس قسم کے تجربات بیان کیے ہیں انہیں پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ قاری کشمیر کی وادیوں میں پھر رہا ہے۔ یہاں انھوں نے محض خوبصورت مناظر کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس تہذیب کے کئی مسائل بھی سمٹ آئے ہیں۔ انسانی ہمدردی اور سیر و سیاحت میں بھی دوسروں کے کرب کو سمجھنے کی

ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ ان کی نگاہ نہایت باریکی کے ساتھ تمام اہم مقامات تک جاتی ہے اور ضروری مسائل پر ٹھہر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خودنوشت مختلف زاویوں سے نہایت دلچسپ ہے۔

ساجدہ زیدی نے علی گڑھ ہاسٹل میں قیام کے دوران ہی ترقی پسندی کا زمانہ دیکھا اور مختلف ترقی پسند ناقدین اور ادبا و شعرا سے ان کی رسم و راہ بھی رہی۔ انھوں نے اس ہاسٹل میں رہتے ہوئے علم و ادب کے نئے منازل طے کیے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی زندگی کارآمد ہوتی چلی گئی۔ ساجدہ زیدی نے ازدواجی زندگی کی خوبصورت شروعات کی لیکن اس سفر میں ان کے لیے کئی طرح کی دشواریاں بھی پیش آئیں۔ ازدواجی زندگی کے متعلق مسائل اور تجربات کو انھوں نے 'اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے' کے عنوان سے نہایت باریکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ساجدہ زیدی نے تقسیم کے بعد پیدا ہونے والے ہنگامی حالات اور قتل و خون کے واقعات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ یہ واقعہ کس طرح ملک کے باشندوں میں عدم اطمینان، بے سکونی اور خوف کا باعث بنا اس کے تمام پہلوؤں کو انھوں نے ''یہ داغ داغ اجالا'' کے تحت بیان کیا ہے۔ ایک موقع پر قتل و خون اور غارت گری کے واقعات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے وہ اس حقیقت کا بھی انکشاف کرتی ہیں کہ 'سخت حیرانی تھی کہ اتنا قتل و خون ہو رہا ہے اور ملک کو تقسیم کر کے اقتدار سنبھالنے والے اہل سیاست کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں۔'' ہجرت اور نئے ملک کا قیام عمل میں آنے کے بعد وہاں کی صورت حال اور نئی نئی آزادی پر انھوں نے گہرے افسوس کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> وہ دور انسان کو ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ کبھی کبھی اس افرا تفری میں یہ بھی محسوس کرتی کہ میں اپنی ذات کے تنگنائے سے نکل کر ایک وسیع و عریض، سفاک، بے رحم، ظالم دنیا کے روبرو کھڑی ہوں۔ قوت مدافعت جواب دے رہی ہے۔ اب کیا کروں؟ اس دنیا میں تو نفرت ہے۔ سیاست ہے۔ کشت و خون ہے۔ انسانیت کا درد لے کر کوئی کہا جائے؟ کیا اسی کا نام آزادی ہے۔ کیا یہی جمہوریت ہے۔ کیا مسلمانان ہند نے اسی آزادی کے لیے اپنے جان و مال کی قربانیاں دی ہیں۔ آزادی کے نغمے گائے ہیں۔ آخر مسلمان ہلاک کیوں کیے جا رہے ہیں؟ آخر کیوں؟ میں ہلاکتوں کا منظر دیکھتی اور اس طرح کے خیالات سے الجھتی رہتی۔ رفتہ رفتہ غم و غصہ پیدا ہونے لگا۔ موت کے اس کھیل کا کوئی جواز نظر نہ آیا۔
>
> (نوائے زندگی، ساجدہ زیدی، ناشر: دہلی اردو اکادمی، سن 2012، ص 130)

ساجدہ زیدی نے اپنی خودنوشت کے بیشتر عناوین شعری انداز میں قائم کیے ہیں۔ بسا اوقات کسی شعر کا کوئی ٹکڑا یا ایک مصرعہ عنوان کی زینت بن گیا ہے۔ اس کی خاص وجہ شعر و شاعری سے ان کی گہری مناسبت تھی۔ وہ خود ایک باکمال شاعرہ تھیں اور ان کی زبان پر شعری اسلوب کے مختلف اثرات نظر آتے ہیں۔ واقعات اور مسائل کے علاوہ اگر اس خودنوشت کا لسانی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو بھی یہ کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ ساجدہ زیدی نے خودنوشت میں صرف اپنے احوال قلم بند نہیں کیے ہیں بلکہ خاندان اور بہنوں سے متعلق بہت سی معلومات بھی کتاب کا حصہ بن گئی ہیں۔ 'نوائے زندگی' ایک ایسی آزاد خیال، بہادر اور باشعور خاتون کی داستان معلوم ہوتی ہے جس میں تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے، سیاسی معاملات میں حصہ لینے، بے خوف ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے اور شعر و ادب کی محفلوں میں شریک ہونے کے واقعات نظر آتے ہیں۔ ساجدہ زیدی ملک کے سیاسی و معاشرتی احوال پر ایک دردمند اور حساس دل مصنفہ کی حیثیت سے اظہار خیال کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خودنوشت پڑھتے ہوئے ایک عہد کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

❐❖❐

Enab Shamim
H-99A, Babar Street,
Muradi Road, Jamia Nagar,
Okhla, New Delhi-110025
enabshamim@gmail.com

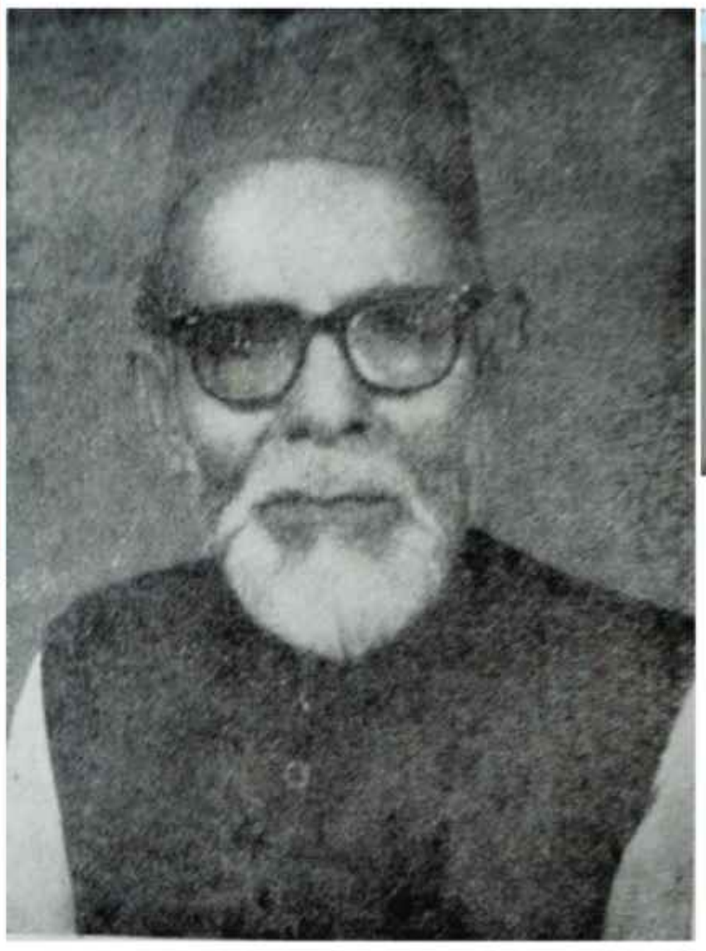

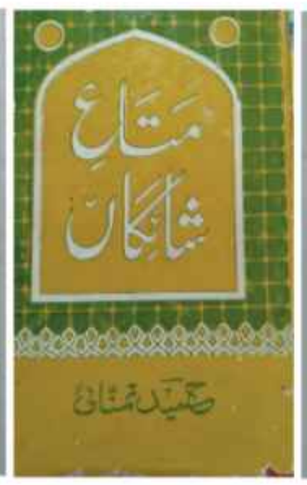

سعدیہ پروین

حمید تمنائی کی غزل گوئی

عرضِ بہار میں اردو غزل گوئی کے میدان میں کچھ نام ایسے ہیں جو اپنی فکری وسعت، فنی مہارت، مضامین کی جدت، ادائیگی میں ندرت اور اشعار میں غنائیت کے باعث ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان مستند و معتبر اسمائے گرامی میں ایک قابلِ احترام نام پروفیسر حمید تمنائی کا ہے۔ ایک ایسے شاعر جنھوں نے اردو غزل کو نئے رنگ و آہنگ سے ہم کنار کیا۔ پروفیسر حمید تمنائی اردو ادب کے ان شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے غزل کو روایتی اور سکہ بند سانچوں میں ڈھالنے کے بجائے ان میں اپنی انفرادیت کے رنگ بھرے۔ ان کا اسلوب اگرچہ کلاسیکی غزل کے طرز اور انداز کی توسیع کرتا ہے اور بعض اوقات یہی وابستگی ان کی شاعری کو روایت پسند بھی بنا دیتی ہے۔ تاہم ان کی غزلوں میں ایک سلیقہ مند رومانیت اور عشق مجازی کی جھلک نظر آتی ہے جن سے نوجوان قارئین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کا کلام نہ صرف روایتی غزل کی موسیقیت اور لطافت کو برقرار رکھتا ہے بلکہ اس میں جدت مضامین اور فکری توانائی کا احساس بھی دلاتا ہے اور یہی خصوصیات ان کو معاصرین میں منفرد شناخت بخشتی ہیں۔

پروفیسر حمید تمنائی کی ولادت 12/اکتوبر 1904 کو موضع حسن پورہ ضلع سیوان (بہار) میں ایک علمی و دینی خانوادے میں ہوئی۔ ان کے والد منشی عبد العزیز غازی پور (یو. پی.) میں سرکاری ملازمت پر تعینات تھے۔ پروفیسر حمید تمنائی نے ابتدائی تعلیم مدرسہ چشمۂ رحمت (غازی پور) میں پوری کی۔ بعد ازاں انھوں نے ملا، منشی، کامل، عالم اور فاضل کی ڈگریاں عربک اینڈ پرسین بورڈ، الٰہ آباد (یو. پی.) سے حاصل کیں۔ 1934 میں انھوں نے پٹنہ (بہار) یونیورسٹی سے ایم. اے. (اردو) کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ کچھ دنوں کے بعد دوران ملازمت انھوں نے بی. آر. اے. بہار یونیورسٹی، مظفر پور (بہار) سے فارسی میں ایم. اے. میں نہ صرف کامیابی حاصل کی بلکہ گولڈ میڈل کے حق دار قرار دیے گئے۔

پروفیسر حمید تمنائی کی پہلی ملازمت گھنا نندر گورنمنٹ ہائی اسکول (اب انٹر کالج)، مسوری ضلع دہرہ دون (اتراکھنڈ) میں اردو و فارسی کے ٹیچر کی حیثیت سے ہوئی۔ اسکول ابھی نیا نیا کھلا تھا اور ادبی ماحول بالکل نہیں تھا۔ اسکول کی فضا انھیں پسند نہیں آئی۔ اس لیے وہ ترکِ ملازمت کر کے سیوان چلے آئے اور مسلسل چار برسوں تک بلا مشغلہ وقت گزارا۔ 1934 میں ان کی تقرری سیوان کے وکٹوریہ میموریل ہائی اسکول میں ہوئی اور اردو و فارسی کے درس و تدریس پر مامور کیے گئے۔ سیوان کے مالویہ کہے جانے والے بیجناتھ پرساد عرف داڑھی بابا نے سیوان میں ڈی. اے. وی. کالج کی بنیاد ڈالی تو انھیں قابل اور قومی جذبے سے سرشار اساتذہ کی ضرورت آن پڑی۔ ان ہی کی ایماء پر پروفیسر حمید تمنائی نے وی. ایم. ایچ. ای. اسکول کی نوکری سے استعفیٰ دے کر ڈی. اے. وی. کالج کی پروفیسری قبول کر لی اور وہیں سے سنہ 1962 میں سبکدوش ہوئے۔ مختصر

علالت کے بعدان کی وفات 9/جنوری 1991 کوسیوان میں ہوئی اورکاغذی محلّہ میں اپنے مکان کے متصل قبرستان میں پیوندِ خاک ہوئے۔

پروفیسر حمید تمنائی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔جن میں حمد، نعت، منقبت، سلام، قصیدہ، مرثیہ، قطعات، نظم، مسدس اورغزلیں شامل ہیں۔ان کی نعتوں کا مجموعہ'لمعات' (1973) اورغزلیات کا مجموعہ''متاع شائگاں'' (1980) شائع ہوچکے ہیں۔ ان کی حیات، شخصیت، شاعری اورادبی وعلمی خدمات پر مشتمل ایک کتاب 'نذرحمید' (1983) کی اشاعت معروف مزاح نگاراحمد جمال پاشانے کرائی تھی۔ان ساری باتوں کے علاوہ یہ بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ پروفیسر حمید تمنائی نے اپنی حیات میں جوعلمی و ادبی، عمدہ شاعری، بہترین نعت گوئی اور قابل تعریف سماجی و درسی خدمات انجام دی ہیں اس اعتبار سے انھیں پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔اس مضمون میں صرف ان کی غزل گوئی کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

پروفیسر حمید تمنائی نے تقریباً تین سوغزلیں لکھی ہیں ان میں ہیئت کے اعتبار سے مسلسل وغیر مسلسل غزلیں، قطع بند غزلیں، اور مردف وغیر مردف غزلیں شامل ہیں۔موضوع کے اعتبار سے ان کی غزلیں عاشقانہ، متصوفانہ، ناصحانہ، فلسفیانہ، مذہبی اور سیاسی ہیں۔ پروفیسر حمید تمنائی کو برجستہ شعر گوئی اور زود گوئی میں کمال حاصل تھا۔ ان کی بعض غزلوں میں چالیس چالیس اشعار ہیں۔ان کی متعدد غزلیں ایسی ہیں جو مطلع اوّل، مطلع ثانی، مطلع ثالث اور حسن مطلع سے مزین ہیں۔ایسا کمال وہی شاعر دکھا سکتا ہے جو بحر، وزن، قافیہ اور ردیف کے ساتھ ساتھ دیگر لوازماتِ شاعری کے حسن اوراس کی سحر کاری سے کما حقہ واقف ہو۔ پروفیسر حمید تمنائی کی غزلیں نہ صرف ادبی اشخاص کومسحور کرتی ہیں بلکہ عام قارئین کے دلوں کوبھی مسخر کرتی ہیں۔ان کی غزلوں میں رومان کی لطافت، سماجی شعور کی حلاوت، فلسفیانہ فکر کی تمازت، اورعرفان کی بصیرت کی جھلک واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں لب ولہجہ کی شائستگی، طرزِ بیاں میں شگفتگی، اسلوب میں سادگی اور واردات قلبی کے اظہار میں متانت کا پورا خیال رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں اثر انگیز ہوگئی ہیں۔متاع شائگاں میں اس طرح کے سیکڑوں اشعارمل جائیں گے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

نہیں جس میں عظمت زندگی، وہ نظام ہے کہ مذاق ہے
جو سنائے کلمۂ کمتری، وہ کلام ہے کہ مذاق ہے

نہیں اس میں شوخیٔ رنگ و بو، نہ نمودِ کیف سرور خو
ترے دست ناز میں ساقیا، کوئی جام ہے کہ مذاق ہے

لعنت کا طوق ایک کرشمہ انا کا تھا
انجام بے شعور خرد کی خطا کا تھا

کیوں آج ہے مطیعِ فرامینِ اہرمن
کل تک یہ بد نصیب خلیفہ خدا کا تھا

یہ نظام ارض وسماں نہیں، یہ حقیقتوں کا نظام ہے
تری عقل کا ہے یہ امتحاں، یہ خرد کو دعوت عام ہے

کوئی تشنگی سے ہے جاں بلب، کوئی پی رہا ہے سبو سبو
یہ مذاق ہے ترا ساقیا کہ، مے کدے کا نظام ہے

پروفیسر حمید تمنائی کی غزل گوئی محض عشقیہ واردات اور سطحی جذبات کا بیان نہیں ہے بلکہ ان میں زندگی کے مختلف رنگوں، داخلی و باطنی کربوں اورزیستِ انسانی کی پیچیدگیوں کو اپنے اندر سمیٹنے کی بھرپور صلاحیت ہے۔ وہ منزل مقصود کی تلاش میں سرگرداں ہیں لیکن انھیں ایسا رہنما نہیں ملا جو ان کی قلبی، ذہنی وفکری کشمکش کے مطابق راستہ دکھلا سکے۔ یہ داخلی کرب اورفکری اضطراب صرف حمید تمنائی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی قومی مسئلہ ہے جو ہر دور میں دکھائی دیتا ہے۔یہ مسئلہ علامتی انداز میں ان کی غزلوں میں بڑی شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔بخوف طوالت چند اشعار پیش کررہی ہوں۔

میں ہوں ایک گم شدہ راہرو، مجھے راہ بر کی تلاش ہے
جو دکھا دے مجھ کو رہ خبر، اسی با خبر کی تلاش ہے

نہیں ہوں میں موسیٰ عامری، جو حواس و ہوش فدا کروں
جو دکھایا تھا کبھی طور پر، مجھے اس شرر کی تلاش ہے

پروفیسر حمید تمنائی کی شاعری ایک وہبی ودیعت تھی۔ ان کی تعلیم وتربیت غازی پور کے مدرسہ چشمۂ رحمت جیسی معروف علمی و دینی درس گاہ میں مکمل ہوئی۔ ابتدا میں انھوں نے اپنی شاعری پر جعفر علی خاں اثر لکھنوی سے اصلاح لی اور بعد میں حضرت تمنا عمادی پھلواروی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ انہی با کمالوں اور اساتذۂ فن کے زیر سایہ ان کی شاعری پروان چڑھی۔ وہ کلاسیکی اور ہم عہد شاعری پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور فکر بلند تھی۔ ان کے جذبات نیک، احساسات لطیف اور خیالات پاک تھے۔ انھوں نے عشقیہ مضامین کے بیان میں شائستگی کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ کلیات حمید تمنائی میں شامل اس طرح کے اشعار سے تلذذ کا احساس نہیں ہوتا بلکہ حسن و عشق کے پیچ وخم کی تفہیم ہوتی ہے۔

نگاہِ ناز کو قاتل بنا دیا تو نے
مری حیات کا حاصل بنا دیا تو نے

محبت میں فغاں بے سود، نالہ بے اثر دیکھا
تڑپتا دل، ترستی آنکھ، برمایا جگر دیکھا

اس کے دل کو مرکز مہر و وفا سمجھا تھا میں
وائے قسمت چیز تھی کیا اور کیا سمجھا تھا میں

صنفِ غزل کی یہ وسعت ہے کہ اس میں ہر طرح کے مضامین باندھے جا سکتے ہیں۔ جہاں روایت پسند بیشتر شعراء نے حسن و عشق، ناز و ادا، گل و بلبل عاشق و معشوق کی کج ادائی جیسے فرسودہ، تلذذ آمیز اور از کار رفتہ موضوعات کو اپنی غزلوں میں مرکزیت عطا کی ہے وہیں بعض شعرا نے ان موضوعات سے انحراف کرتے ہوئے مسائل زیست، معاشرتی بحران، سنگین سیاسی و سماجی حالات اور تہذیبی زوال جیسے عنوانات کو اپنی غزلوں میں مناسب جگہ دی ہے اور اصلاح معاشرہ اور کردار سازی کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر حمید تمنائی کی شاعری کا بیشتر حصہ ان ہی موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ انھوں نے زوال آمادہ قوم میں حمیت، حوصلہ اور سربلندی کے ساتھ جینے کا پیغام دیا ہے اور اس کے لیے مسلم نشاۃ ثانیہ کے واقعات، قرآنی اور تاریخی تلمیحات کا استعمال نہایت فنکارانہ ہنر مندی سے کیا ہے۔ ان کی غزلوں کے یہ اشعار ہمارے ضمیر، غیرت اور عزتِ نفس کو بیدار کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس ضمن میں علامہ اقبال کی پیغام رسانی کا اتباع کرتے ہوئے قوم و ملت کے لیے ایسے اشعار خلق کیے ہیں جو ہمارے لیے مشعل راہ سے کم نہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

بخشا تھا امتیازِ خلافت اگر ہمیں
پھر کیوں بھلا نکالے گئے گلستاں سے ہم

زباں تھی محو تقاضائے دید، ہوش نہ تھا
کلیم جلوؤں کی توفیر میں خموش نہ تھا

مری تعمیر ہے آمادہ بہ عصیاں ہونا
کر کے ترک وطن عالم کا نگہباں ہونا

اڑیں گی دامنِ انسانیت کی دھجیاں کب تک
رہیں گے بے خبر حالات سے کرّ و بیاں کب تک

کبھی سوچا ہے تو نے اے حمید! اس دار فانی میں
رہے گی زندگانی کا تری نام و نشاں کب تک

پروفیسر حمید تمنائی کی غزلوں کا ایک خاص انفراد ان کی غنائیت ہے۔ غنائیت سے مراد موسیقیت اور آہنگ ہے جو اشعار میں ایک خاص طرح کی لذت اور اثر پیدا کرتا ہے۔ غنائیت غزل کی روح

سمجھی جاتی ہے کیوں کہ یہ شعر کی شدت کو بڑھا دیتی ہے۔ جو اشعار موسیقی، نغمگی اور آہنگ سے مملو ہوتے ہیں وہ جلد یاد ہو جاتے ہیں۔غنائیت کی وجہ سے شعر کو ترنم کے ساتھ پڑھنا یا گانا آسان ہوتا ہے۔اسی لیے بہت سی نظمیں، غزلیں، مسدس اور مراثی وغیرہ موسیقی کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ پروفیسر حمید تمنائی کو جنھوں نے دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ وہ بیشتر اوقات کچھ نہ کچھ گنگناتے رہتے ہیں۔ مشاعروں میں بھی وہ تحت اللفظ اور ترنم دونوں طرح سے اپنا کلام سناتے تھے۔ان کی متعدد غزلیں غنائیت، نغمگی اور موسیقیت سے لبریز ہیں۔مثال دیکھیں۔

تم نے جو مجھ کو دیکھ لیا سر سے پاؤں تک
بگڑا ہوا ہے رنگ فضا سر سے پاؤں تک

آئے بھی خواب میں تو نہ کھل کر مل وہ سکے
گھیرے رہا خیالِ حیا سر سے پاؤں تک

بدلے گا دور آسماں آج نہیں تو کل سہی
ڈھونڈے گا تجھ کو باغباں آج نہیں تو کل سہی

زخم دل ان کو دکھایا تو برا مان گئے
قصۂ درد سنایا تو برا مان گئے

عشق کو رسوا نہ کیا ہے نہ کریں گے
ہم نے یہ تماشا نہ کیا ہے نہ کریں گے

وہ جلوۂ رخ اپنا ، دکھائیں نہ دکھائیں
ہم نے تو تقاضا نہ کیا ہے نہ کریں گے
ساقی نے نکالا ہے مے خانے سے آخر
اس نظم کا چرچا نہ کیا ہے نہ کریں گے

'نذرِ حمید' کی اشاعت 1983 میں ہوئی۔اس کے مرتب مشہور و معروف ظرافت نگار احمد جمال پاشا ہیں۔ یہ کتاب پروفیسر حمید تمنائی کی حیات، فن، فکر اور شاعری پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ تفہیم حمید کی پہلی کوشش تھی۔ پروفیسر احمد جمال پاشا سے ان کی نزدیکیاں جگ ظاہر تھیں۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا تھا جب دونوں آپس میں نہ ملتے ہوں۔ احمد جمال پاشا نے ان کے شاعرانہ امتیاز و انفراد پر ایک مفصل مضمون قلم بند کیا ہے۔ وہ پروفیسر حمید تمنائی کو اساتذۂ لکھنؤ کا ہم پلہ سمجھتے تھے۔ان کی غزل گوئی کے متعلق احمد جمال پاشا رقم طراز ہیں:

> ''پروفیسر حمید تمنائی ایک قادرالکلام اور مسلم الثبوت استاد ہیں، جنھوں نے ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزلوں میں تغزل اور استادانہ فن کاری ہے۔ ان کی شخصیت جتنی دلکش اور رنگا رنگ ہے ویسے ہی ان کا کلام بھی گونا گوں شعری خصوصیات کا آئینہ دار ہے جس کی شگفتگی اور تازگی سدا بہار ہے''۔

(نذر حمید۔ مرتبہ، احمد جمال پاشا۔ مضمون، پروفیسر حمید تمنائی: ایک رنگا رنگ شخصیت، ص 32)

کلیات حمید تمنائی ابھی طباعت کے مرحلے میں ہے۔اس میں ان کی 225 غزلوں کا ایک باضابطہ باب 'غزلیات' کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ان کے علاوہ ''متاع شائگاں'' میں 75 غزلیں طبع ہو چکی ہیں۔اتنی بڑی تعداد میں موجود غزلوں کا تجزیہ ایک مختصر مضمون میں ممکن نہیں ہے۔لیکن اردو ادب کے ناقدین، قارئین اور اساتذہ اس پر توجہ دیں تو ممکن ہے کہ ان غزلوں کی تمام خصوصیات واضح ہو جائیں۔ آج اس بات کو سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ اردو ادب علی الخصوص دبستان بہار میں انھیں وہ مقام و مرتبہ نہیں ملا جس کے وہ حقدار تھے۔ایسی نابغۂ زمانہ شخصیت برسوں بعد پیدا ہوتی ہے۔

Sadia Perween
Dept. of Urdu
Jai Prakash University
Chapra-841302 (Bihar)
sadiaimran22oct2016@gmail.com

مسرور صغریٰ

ہم پہ ہی فقط کیا یہ زمانے پہ لگے ہیں
سب تیر ترے آکے نشانے پہ لگے ہیں

کیا جانئے کب کس کی دعا کام میں آجائے
اس واسطے روٹھوں کو منانے پہ لگے ہیں

اس پیڑکو وہ جڑ سے مٹانے پہ بضد ہے
سو سال جسے بننے بنانے پہ لگے ہیں

ہم یوں بھی وفاؤں کے طلبگار نہیں تھے
وہ پھر بھی ہمیں چھوڑ کے جانے پہ لگے ہیں

تکلیف بڑھا دیں گے وہ پھر ضرب لگا کر
ہم زخم جگر جن کو دکھانے پہ لگے ہیں

رکھ دوں نہ قدم عرش پہ اس خوف سے وہ بھی
شہرت کا ہنر مجھ سے چرانے پہ لگے ہیں

وہ جن کی شرارت سے مرے خواب جلے تھے
حیراں ہوں وہی آگ بجھانے پہ لگے ہیں

رہ جائے نہ کچھ طاق محبت پہ بجز خاک
کم ظرف مرے گھر کو جلانے پہ لگے ہیں

صغریٰ یہ حقیقت ہے کہ ہم تجھ سے بچھڑ کر
بگڑی ہوئی تقدیر بنانے پہ لگے ہیں

Dr. Masroor Soghra
Deptt. of Urdu
Assistant Prof. (Guest Faculty)
Jai Nagar-(Bihar)
masroorsoghra@gmail.com

تنویر کوثر

عورت

خطرے تھے موڑ موڑ پہ بچنا پڑا تمھیں
نکلیں اکیلی گھر سے تو ڈرنا پڑا تمھیں
ٹھوکر بھی کھا کے گرنا سنبھلنا پڑا تمھیں
اکثر تباہیوں سے گزرنا پڑا تمھیں

ملتا جہاں سکون ہو ایسا تو گھر ملے
چاہت ملے وفا ملے الفت کا در ملے
ممکن نہیں شمار ستم اس قدر ملے
ذلت کی چوٹ سہہ کے بکھرنا پڑا تمھیں

آزادیوں کے خواب دکھائے گئے مگر
کھا کر فریب روز بکھرنا تھا ٹوٹ کر
رستے بھی واپسی کے نہ آئے کبھی نظر
رنج و الم اٹھا کے سسکنا پڑا تمھیں

جھوٹا ہر ایک خواب دکھایا گیا یہاں
عہدہ دلا کے کوئی گھمایا گیا یہاں
پھر تم کو ہر طرح سے ستایا گیا یہاں
ان کے لگائے زخم پہ رونا پڑا تمھیں

سچ آ چکا ہے سامنے ظالم کے حال کا
کب یہ جواب دیں گے ہمارے سوال کا
ہر جال بن دیا تھا نہایت کمال کا
پھنس کر نکل نہ پائے تو مرنا پڑا تمھیں

Dr. Tanveer Kausar
Add. Vill+Post- Zainuddinpur, Hanswar,
Ambedkar Nagar, Uttar Pradesh- 224143
Mob. No- 9956152743
Email id. kausart333@gmail.com

یاسمین اختر

گھر کی زینت

امی کی طبیعت خراب تھی۔ میں ان کو لے کر ڈسپنسری چلی گئی۔ مہینوں بعد گھر سے باہر نکلی تھی۔ مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ امی نے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور میں پیچھے بیٹھ گئی۔ چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ ایک نسوانی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''میں تو پہچان ہی نہیں پا رہی ہوں.... دبلی پتلی سی زینت کتنی موٹی ہوگئی ہے۔''

وہ میرے پڑوسی کی چچی تھیں۔ انھوں نے پھر کہا۔ ''تمھاری تینوں بہنوں کی شادی ہوگئی اور تم؟.... بیچارے ابّو امّی ضعیف العمر ہیں... ہاتھ پیلے ہوجاتے تو اچھا ہوتا۔''

یہ سنتے ہی دل میں شعلے بھڑک اٹھے اور میں بے قرار ہوگئی۔ آس پاس لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ بول بھی نہیں پا رہی تھی۔ بولتی بھی تو کیا بولتی؟ بس خاموش بیٹھی سنتی رہی۔

اس رات میں ٹھیک سے سو نہیں سکی تھی۔ ساری رات زندگی کے نشیب وفراز کا احتساب کرتی رہی۔ جہاں بھی جاتی ہوں یہی بات سننے کو ملتی ہے۔ ابھی تک تمھاری شادی نہیں ہوئی.... تمھارے ابو امی کے جیتے جی ہاتھ پیلے ہوجاتے تو اچھا ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ جانتے ہیں تو پوچھتے کیوں ہیں؟ اس طرح کی باتوں سے بہت تکلیف ہوتی ہے مجھے۔ کاش لوگ میری دلی کیفیت کو سمجھ پاتے۔ لوگوں کا کیا، انہیں تو بس طعنہ زنی کا موقع چاہیے۔ پتا نہیں یہ سب مجھے ہی سننا پڑتا ہے یا پھر میری جیسی دوسری لڑکیوں کو بھی؟ پہلے تو اکیلا گھر تھا، جو بھی ہوتا گھر ہی تک محدود رہتا تھا۔ لیکن اب؟ بھابی کی طنزیہ نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بھابی کا خیال آتے ہی میری بے چینی اور بڑھ گئی۔ اس دن کتنی شرمندگی ہوئی تھی جب بھابی کی امّاں نے کہا تھا۔ ''دلہن بننے کا ہنر کوئی زینت سے سیکھے۔''

میں کہاں دلہن بنتی ہوں؟ لوگ مجھے دیکھنے آتے ہیں اور گھر والے دلہن کی طرح سجا سنوار کر مجھے کھڑی کر دیتے ہیں۔ ہر بار وہ میرے لیے زخمی ہوتے ہیں پھر بھی ہمت نہیں ہارتے۔

اس روز بھی صبح صبح میری دائیں آنکھ پھڑک رہی تھی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ میرے ساتھ ضرور کچھ برا ہونے والا ہے۔ جمعہ کا دن تھا صبح کی چائے کے بعد میں حسب معمول گھر کی صاف صفائی میں لگ گئی تھی۔ ویسے دو کمرے اور ایک برآمدے کے علاوہ تھا ہی کیا؟ ہاں، ایک بڑا سا آنگن اور اس میں آم کے دو پیڑ، ایک امرود اور ایک ناریل کے پیڑ ہیں۔ تنگ آ گئی ہوں میں ان سوکھے پتوں کو کنارے لگاتے لگاتے۔ کروں بھی تو کیا کروں؟ بھابی کو گھر کے کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تو سارا دن موبائل فون لے کر بیٹھی رہتی ہیں۔ فون تو میرے پاس بھی ہے لیکن میں سارا دن اسے لے کر نہیں بیٹھی رہتی۔ میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہے۔ آدھا دن گھر کے کام کاج میں نکل جاتا ہے اور آدھا دن ابّو امّی کی خدمت میں۔ رات بستر پر جاتی ہوں تو طرح طرح کی باتیں ذہن میں آتی ہیں اور میں؟....

میں اپنے ہی خیالوں میں تھی امی کی آواز کانوں میں پڑی۔ ''زینت، کہاں ہو تم؟.... ابو ناشتے کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''جی امی، ابھی لائی۔'' کہہ کر میں باورچی خانے کی طرف بڑھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر کپڑے دھونے بیٹھ گئی۔ سوچا کہ بھابی غسل خانے سے نکلیں گی تو میں چلی جاؤں گی۔ کھانا بھی تو بنانا ہے۔ ویسے ہمارے یہاں جمعہ کو سادہ کھانا بنتا ہے۔ دال، چاول اور سبزی۔ ہم لوگوں کو اتوار منانے کی عادت ہے۔ ابو کے دفتر میں اتوار کو چھٹی رہتی تھی۔ اسکول اور کالج میں بھی چھٹی! لیکن اب وہ دن کہاں رہے؟ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ میں بھی تو بدل گئی ہوں۔ کتنی شوخ، کتنی چنچل تھی میں۔ لیکن اب بالکل سنجیدہ ہوگئی ہوں۔ چھوٹی بہن رونق تھی تو اکیلے پن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اس کی شادی ہوگئی اور میں؟

غسل کر کے جیسے ہی نکلی، کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ''کون؟'' امی دروازے کی جانب بڑھتی ہوئی بولیں۔

اور جیسے ہی دروازہ کھلا زرینہ پھوپھی کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ پھوپھی میرے ابو کی چچازاد بہن تھیں۔ انھوں نے امی سے کہا۔ ''بھابی، زینت کا رشتہ کہیں طے ہوا یا نہیں؟''

''ابھی تک تو نہیں.....'' امی نے آہستہ سے کہا۔

''تو کیا جہاں میں کہوں گی، کریں گی آپ؟''

''مناسب رہا تو ضرور کروگی۔'' امی بولیں۔

''راج کرے گی آپ کی بیٹی.... سچ کہہ رہی ہوں بھابی.... مکان دیکھیں گی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی.... تاج محل ہے تاج محل!...''

''لیکن زرینہ.... تاج محل تو مقبرہ ہے۔'' امی نے کہا۔

''توبہ توبہ بھابی.... اللہ معاف کرے.... ان کا تاج محل کوئی مقبرہ نہیں ہے.... وہ ایک عالی شان بنگلا ہے.... بنگلے کے سامنے لمبا چوڑا باغ.... رنگ برنگے پھولوں کی کیاریاں اور فرش پر ہری بھری گھاس.... مانو کوئی دبیز قالین بچھی ہو.... چبوترے پر زینت بیٹھے گی تو کیاریوں کے رنگ برنگ پھول ہوا کے جھونکوں سے ایسا جھومیں گے جیسے جھک جھک کر سلام کر رہے ہوں.... باغ کے سامنے ڈرائنگ روم اور اس کے اندر سجاوٹ کے جو سامان ہیں وہ انتہائی خوبصورت.... ارے بیڈروم کا نقشہ تو میں کھینچ ہی نہیں سکتی... ایک بڑا سا ہال اور اس کے اندر.....''

''لیکن زرینہ.... لڑکا کیا کرتا ہے؟'' امی، پھوپھی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پوچھ بیٹھیں۔ شاید انہیں یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اتنے بڑے گھر میں ان کی بیٹی کا رشتہ طے ہوسکتا ہے۔

''تم جیسا کہہ رہی ہو سب کچھ تو ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔'' امی بولیں۔ ''مگر تمہارے بھیا سے مشورہ کیے بغیر میں کیا جواب دوں؟''

''کہاں ہیں بھیا.... کہیں نظر نہیں آرہے ہیں؟'' پھوپھی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔''

''مت پوچھئے بھابی!.... اب میں کیا بتاؤں.... لاکھوں کا کاروبار ہے ان کا.... بہت سارے لوگوں کی روزی روٹی ان کے کارخانے سے جڑی ہے.... شریعت کا پابند.... کہتے ہیں، خدا نے مجھے سب کچھ دیا ہے جہیز لے کر کیا کروں گا اور جب جہیز ہی نہیں چاہئے تو اپنے برابر والوں کے گھر کیوں جاؤں.... بہتر ہوگا کہ کسی معمولی گھر کی لڑکی کو بیاہ کر لے آؤں۔''

پھوپھی کی باتیں سن کر میں نے اپنے آپ میں پھرتی محسوس کی۔ کیا واقعی اس دور میں ایسے لوگ موجود ہیں۔ میرے اندر امید کی کونپلیں پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ لیکن فوراً ہی مرجھا گئیں۔ سرور اور تسکین تو ہر بار دغا دیے جا رہے ہیں مجھے۔

''تم جیسا کہہ رہی ہو سب کچھ تو ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔'' امی بولیں۔ ''مگر تمھارے بھیا سے مشورہ کیے بغیر میں کیا جواب دوں؟''

''کہاں ہیں بھیا.... کہیں نظر نہیں آرہے ہیں؟'' پھوپھی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ کسی کام سے باہر گئے ہیں....آجائیں گے پھر میں بات کروں گی۔''

''بات چیت تو ہوتی رہے گی بھابی....بس ایک بار چل کر تو دیکھ لیجیے....انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔''

''لیکن زرینہ، تمھارے بھیا سے پوچھے بغیر میں نہیں جاسکتی۔''

امی کی بات سن کر پھوپھی نے کہا۔''معاف کرنا بھابی.... میں کہنا تو نہیں چاہ رہی تھی پر بات نکلی ہے تو بول رہی ہوں....میری بیٹی فوزیہ اور زینت ہم عمر ہیں....دونوں کی دوستی بھی خوب رہی.... سالہا سال پہلے فوزیہ کی شادی ہوگئی....اس کے دونوں بچے اسکول اور کالج میں پڑھ رہے ہیں۔''

ان کی باتیں سن کر میری آنکھیں بھر آئیں۔سر بھی چکرانے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں منہ کے بل گر جاؤں گی۔ میں جلدی سے اپنے کمرے میں آکر آنکھیں بند کرکے کرسی پر بیٹھ گئی۔ پرانے دن یاد آنے لگے اور وہ دن جس کا ہر لڑکی کو بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔

بی اے کی پڑھائی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ میرا رشتہ طے ہوگیا تھا۔سب لوگ خوش تھے۔ میں بھی بہت خوش تھی۔خوشی اس بات کی تھی کہ فوزیہ کے ساتھ ساتھ میری بھی شادی ہوجائے گی۔ گھر میں منگنی کی تیاریاں ہورہی تھیں۔لیکن منگنی کی تاریخ طے نہیں ہوئی تھی۔لڑکے کی ماں کو اپنے شوہر کا انتظار تھا۔وہ کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے تھے۔ مجھے لڑکی کی ماں نے پسند کیا تھا۔انھوں نے اپنے شوہر کو فون کرکے اس رشتے کے بارے میں بتادیا تھا۔ان کے شوہر، دولت انصاری نے ہامی بھر لی تھی ،لیکن جب گھر آئے تو منع کردیا۔ان کی بیوی نے بہت سمجھایا مگر وہ نہیں مانے۔

ان کا کہنا تھا۔'' رشتہ برابر والوں سے ہوتا ہے....دونوں گھرانوں میں بہت فرق ہے...تم نے میرے موبائیل فون پر لڑکی کی تصویریں بھیجی تھیں....گھر اور گھر کے حالات سے بھی آگاہ کرنا چاہئے تھا....مجھے پہلے معلوم ہوتا تو کبھی ہامی نہیں بھرتا۔''

اس رات گھر کا کوئی فرد نہیں سو پایا تھا۔

میرے ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ دم توڑ گئی تھی۔ایک عرصہ گزر گیا۔آج بھی مسکرانے سے قاصر ہوں۔ دولت انصاری نے کیا ٹھوکر ماری، زندگی ہی ٹھوکر مارگئی۔کافی دنوں کے بعد ایک اور جگہ رشتہ طے ہوا۔لیکن بات نہیں بنی۔لڑکے والوں نے یہ کہہ کر منہ موڑ لیا کہ لڑکی کی منگنی ہوتے ہوتے رک گئی۔آخر کوئی تو وجہ ہوگی۔اس کے بعد بھی کیے رشتے آئے مگر....

دوپہر تقریباً ڈھائی بجے امّی امیدوں اور ارادوں سے بھرپور دل لیے زرینہ پھوپھی کے ہمراہ گھر سے باہر نکل گئیں۔اس درمیان ابو آگئے تھے لیکن تھکے ہونے کے سبب انھوں نے پھوپھی اور امی کے ہمراہ جانے سے انکار کردیا۔ وہ کھانا کھا کر آرام فرمانے لگے۔ میری بھی آنکھ لگ گئی اور جب آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ ڈوبتے سورج کی سرخی کائنات کو سرخ رو کر رہی تھی۔میں برتنوں کو اکٹھا کرنے لگی۔ابھی سارے برتن دھوئے بھی نہیں تھے کہ امی کی آمد کا احساس ہوا۔میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔پتا نہیں وہاں کیا ہوا ہوگا؟ ہر بار تو چہرے کا رنگ دیکھ کر نتیجہ جان لیتی تھی لیکن اس روز تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔اس روز مجھے اپنی بے بسی کا بہت شدت سے احساس ہوا۔ بے چینی بھی ہورہی تھی۔بے چینی اس بات کی نہیں تھی کہ بات بنی یا نہیں، بلکہ اس بات کی تھی کہ آخر کب تک میر ی نمائش ہوتی رہے گی۔اگر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوتی تو کب کا منع کردیتی۔تب شاید یہ دن دیکھنا نہیں پڑتا۔

مغرب کی نماز پڑھ کر ابو نے امی سے پوچھا۔''کہو کیسا رہا؟''

''مت پوچھئے....اللہ یہ دن کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے....یہ آپ کی بہن زرینہ...نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے....گھر چڑھ کر کیسے طعنے مار گئی....اب میں آپ سے کیا کہوں....دراصل ہم لوگ اتنے پریشان رہتے ہیں کہ ذہن میں کوئی بات رہتی ہی نہیں....زرینہ نے تاج منزل کا ذکر کیا تھا....میں نہ جانے کیسے بھول گئی....اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ وہ منزل نہیں انصاری میاں کا مقبرہ ہے تو نہیں جاتی۔''

انصاری میاں کا مقبرہ سنتے ہی میرے ہاتھ پاؤں سن ہوگئے، چہرہ فق ہوگیا، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔اندھوں کی طرح

ٹٹول کر کسی طرح اپنے کمرے میں آئی اور ہر شے سے بے نیاز بستر پر لیٹ گئی۔

''دولت انصاری؟'' ابو نے نام دہرایا۔

''ہاں!...وہی دولت انصاری جو بہت حد تک میری بچی کی اس درد بھری زندگی کا ذمہ دار ہے۔'' امی روہانسی ہو کر کہنے لگیں۔ ''دھن ، دولت، گاڑی، بنگلا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ ایک مٹھی دانے کو ترس رہا ہے....بیٹے، بہو، پوتے ، پوتیاں سب اس سے دور....دونوں بیٹے اپنے اپنے مکان میں رہتے ہیں اور وہ تاج منزل میں بالکل تنہا اور اکیلا....میں اندر گئی اور نام سنتے ہی باہر نکل گئی.... پڑوس کی ایک عورت سے ملاقات ہوگئی....اس سے میری تھوڑی شناسائی تھی....اس نے بتایا کہ انصاری میاں کی بیوی کو گزرے ہوئے ابھی چار مہینے ہی ہوئے ہیں....کہتا ہے گھر کی زینت تو گھر والی ہی ہوتی ہے....بیوی کیا مری بیٹا، بہو، پوتے ، پوتیاں سب کے سب بے ایمان اور نکمے ہوگئے....اس گھر کی شان وشوکت کو برقرار رکھنے کے لیے اسے ایک لڑکی چاہے....ایک ایسی لڑکی جو اس کی اور اس کے گھر کی ذمہ داریاں اٹھائے۔''

❐❖❐

Dr. Yasmin Akhtar
Department of Urdu
C.M.J.College
Donwarihat, Khutauna
Madhubani-847227(Bihar)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر..... بتاریخ.....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/145 روپے 90092010045326 :A/C، IFSC:CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : .....

پتہ : .....

.....

.....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

افسانے

رضیہ سلطانہ

بدلتی تقدیریں

''غضب ہو گیا شمع، صبیحہ کا نکاح شہباز سے طے ہو گیا۔''

''رافعہ آپا آپ اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں؟ یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا۔''

''شمع یہ نہیں ہونا چاہیے تھا، صبیحہ جیسی نیک اور تعلیم یافتہ لڑکی کا نکاح شہباز جیسے اوباش سے نہیں کرنا چاہیئے۔ صبیحہ نے احتجاج کیوں نہیں کیا۔''

''آپا یہ دنیا ہے اور اس میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ شہباز میں لاکھ برائیاں سہی مگر وہ دولت مند ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے اور بے چاری صبیحہ کے گھر غربت کا سایہ ہے بھلا ایسے رشتے کے لیے کون انکار کر سکتا تھا؟ مفلسی انسان کو بہت سے سمجھوتے کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔''

''شمع میں اس بابت فردوس خالہ سے ضرور بات کروں گی وہ صبیحہ کی زندگی اس طرح برباد نہیں کر سکتیں۔''

''آپا مجھے نہیں لگتا اس سے فردوس خالہ کے فیصلے میں کوئی تبدیلی آئے گی۔''

''شمع میں صبیحہ کے ساتھ ایسی زیادتی ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔''

دوسرے دن رافعہ فردوس خالہ کے گھر پہونچ گئی وہ اپنے خاص انداز میں دالان میں چارپائی پر بیٹھی پان بنا رہی تھیں۔ رافعہ ان کے پاس بیٹھ گئی اس نے ڈرتے ہوئے اپنی بات شروع کی۔ ''فردوس خالہ، آپ صبیحہ کی ماں ہے آپ سے زیادہ اس کے حق میں کون بہتر سوچ سکتا ہے لیکن کیا آپ کو نہیں لگتا شہباز رافعہ کے لیے مناسب انسان نہیں ہے۔''

یہ سنتے ہی فردوس خالہ جواب تک بہت خوش لگ رہی تھیں، غصّہ میں تیوری چڑھا کر بولیں، ''کیوں؟ کیا کمی ہے شہباز میں؟ اچھے گھر سے تعلق رکھتا ہے دولت کی فراوانی ہے صورت شکل بھی ٹھیک ہے۔''

''خالہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں میں کس بابت بات کر رہی ہوں، اس کی حرکتوں سے سب واقف ہیں۔''

''بھلا ایسی کون سی نازیبا حرکتیں وہ کرتا ہے جو تم اس طرح کہہ رہی ہو۔ بے پناہ دولت ہے اس سے عیش کرتا ہے کیا کسی کے گھر چوری ڈکیتی کرتا ہے۔''

''خالہ آپ تو دانستہ اس کے عیبوں پر نظر ڈالنا نہیں چاہتیں۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کیسا اجڈ انسان ہے آئے دن کسی نہ کسی سے اس کی مار پیٹ ہوتی رہتی ہے پچھلی بار تو کسی سے جھگڑا کرنے کے سبب دس دن جیل بھی رہ کر آیا تھا۔''

''مجھے معلوم ہے وہ واقعہ، گرم خون ہے کسی سے تو تو میں میں ہوئی اور ہاتھا پائی ہو گئی، اس کا کیا یہ مطلب ہے کہ وہ لوگوں سے زبردستی لڑتا ہے۔''

''خالہ میں نے سنا ہے کہ وہ جوا بھی کھیلتا ہے اور اس کے یار دوست بھی بھلے انسان نہیں ہیں۔''

''جوا کھیلتا ہے تو کیا ہوا، اتنی دولت ہے تو کیا اپنے شوق اور خوشی کے لیے تھوڑے پیسے خرچ نہیں کر سکتا، جوئے کے لیے کسی سے ادھار تو نہیں مانگتا قرض تو نہیں لیتا، اپنی اور اپنے باپ دادا کی

کمائی سے کھیلتا ہے اور پھر یہ تو رئیسوں کے شوق ہوتے ہیں۔''

''خالہ ایک بار صبیحہ کی مرضی بھی جان لیتیں۔'' رافعہ نے ایک کوشش اور کی خالہ کا فیصلہ بدلنے کی۔ ''صبیحہ سے کیا پوچھنا، وہ ابھی بچّی ہے اسے دنیا داری کی سمجھ کہاں۔ رافعہ تم تو یہ سمجھ رہی ہو کہ میں اپنی بیٹی کی دشمن ہوں میں نے دنیا دیکھی ہے اور جانتی ہوں کہ ایک غریب گھر کی بیٹی کی شادی اتنی آسانی سے نہیں ہوتی، تمھیں کیا لگتا ہے میں نے کسی نیک اور اچھے گھر کے لڑکے سے اس کی شادی کی کوشش نہیں کی مگر ہر جگہ جہیز کی ایک لمبی فہرست تیار تھی ان کی ان تمام فرمائشوں کو پورا کر پانا مجھ بیوہ کے لیے ناممکن تھا۔''

''خالہ تمام لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے کوئی نیک شریف اور غریب لڑکا ضرور ایسا ہوگا جو بنا جہیز کے شادی کے لیے تیار ہو۔''

''تم چاہتی ہو کہ میں اپنی بیٹی کی شادی کسی غریب انسان سے کردوں تاکہ وہ زندگی بھر مفلسی کی چکّی میں پستی رہے تم نے زندگی میں کبھی تنگ دستی کا سامنا نہیں کیا رافعہ، اس لیے اس طرح کی باتیں کر رہی ہو مجھ سے پوچھو مفلسی کیا ہوتی ہے، غریبی انسان کی ہر خواہش کیسے مار دیتی ہے، میرے ماں باپ نے بھی تمھارے خالو کی شرافت دیکھ کر ان سے میری شادی کی تھی مگر اس شرافت نے مجھے کیا دیا ان کی شرافت کی وجہ سے تھوڑی سی جو خاندانی جائیداد تھی وہ بھی ان کے بھائیوں نے ہڑپ لی اور آج ہم کرائے کے مکانوں میں دربدر پھرتے رہتے ہیں، میری بھی کچھ تمنائیں تھیں، آرزوئیں تھیں مگر مفلسی کی سیج پر سب بلی چڑھ گئیں۔ اپنی ماں کو تم نے دیکھا کس نفاست سے رہتی تھیں، ہر جمعہ میں نیا جوڑا پہنتیں کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی اور مجھے نئے کپڑے کی صورت عید پر ہی دیکھنے کو ملتی اور کبھی کبھی تو وہ بھی نصیب نہ ہوتا اور اکثر ایک وقت کھا کر دوسرے وقت ملے گا یا نہیں کی فکر رہتی تھی میں نہیں چاہتی کہ میری بچی بھی ان تمام پریشانیوں کا سامنا کرے اور زندگی میں خوشیوں کے لیے ترستی رہے۔''

''خالہ زندگی میں پیسوں سے ہی ساری خوشیاں حاصل نہیں کی جاسکتیں۔''

''رافعہ کیا روایتی جملے بول رہی ہو زندگی کی حقیقت کچھ اور ہے، پیسوں سے ساری خوشیاں حاصل نہیں کی جاسکتیں مگر بہت سی خوشیاں صرف پیسوں سے مل سکتی ہیں بھلا خالی پیٹ بھی تم نے کسی کو خوش ہوتے دیکھا ہے۔''

''خالہ پھر بھی میں تو یہی کہوں گی اگر آپ اس معاملہ میں ایک بار اور سوچتیں تو بہتر ہوتا''

''رافعہ میں فیصلہ کر چکی ہوں اور اب دو دن کے بعد ان لوگوں کا نکاح بھی طے ہو چکا ہے شادی کے تمام اخراجات وہ لوگ خود اٹھائیں گے'' یہ کہہ کر فردوس بیگم اس انداز سے اپنے لیے پان بنانے میں مصروف ہوگئیں جیسے اب وہ رافعہ سے مزید کچھ سننا نہیں چاہتی تھیں۔ رافعہ کو بھی اس کے آگے کچھ کہنا لاحاصل لگا، جاتے ہوئے ایک نظر اس نے باورچی خانہ میں کام کرتی ہوئی صبیحہ پر ڈالی اور اس کی بے چارگی پر ایک ٹھنڈی سانس لی اور چلی گئی۔

صبیحہ نے بھی رافعہ کو جاتے ہوئے دیکھا اور ایک تیکھی مسکراہٹ یہ سوچ کر اس کے لبوں پر بکھر گئی کہ رافعہ کی کوششیں بھی اس کی قسمت بدلنے میں رائیگاں گئیں۔

رات میں جب صبیحہ بستر پر لیٹی تو مختلف خیالات اس کے ذہن میں گھومنے لگے گزرے ہوئے لمحے آنے والی پریشانیاں۔ اپنی بربادی کو دیکھ کر بھلا کون خاموش رہتا ہے لب چپ بھی ہو جائیں مگر آنکھیں کہنا نہیں مانتیں، صبیحہ بھی سبک سبک کر رو رہی تھی آج اسے فراز کی بہت یاد آرہی تھی، فراز سے ہوئی وہ پہلی ملاقات جب کالج سے واپسی میں ایک دن اچانک ان کی کالج بس خراب ہوگئی تمام لڑکیاں پیدل ہی اپنے گھروں کی جانب چل دیں اس نے بھی گھر کا رخ کیا اسے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک جم غفیر نظر آیا قریب جا کر معلوم ہوا کہ ایک بزرگ عورت جنہیں وہ اکثر بس اسٹاپ پر بیٹھے دیکھا کرتی تھی کو ایک ٹرک والا ٹکر مار گیا ہے اور وہ خون میں لت پت زمین پر بیہوش پڑی ہیں بھیڑ میں سے کوئی انھیں اسپتال لے جانے کے لیے تیار نہیں تھا اچانک اس نے دیکھا کہ ایک شخص بھیڑ کو چیرتا ہوا نمودار ہوا اس نے ایک شکایت آمیز نگاہ لوگوں پر ڈالی اور اس زخمی عورت کی طرف بڑھ کر اس نے ایک آٹو والے کو آواز دی اور

بوڑھی عورت کو اٹھاتے ہوئے صبیحہ کی جانب دیکھ کر کہا ''محترمہ کم سے کم آپ تو انھیں اٹھانے میں میری مدد کریں'' بغیر جواب دیئے وہ بھی اس عورت کو اٹھانے لگی اور وہ دونوں انھیں آٹو میں لے کر اسپتال آ گئے، اسپتال میں ان کا آپریشن کیا گیا اس پورے وقت میں صبیحہ نے محسوس کیا کہ وہ بہت بے چین ہے جیسے وہ اس کی کوئی اپنی ہیں اس نے ہمّت جٹا کر اس سے پوچھ ہی لیا ''کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟

''نہیں''

''پھر آپ اتنے بے چین کیوں ہیں؟''

''کیا صرف اپنوں کی ہی تکلیف دیکھ کر بے چین ہوا جا سکتا ہے دوسرے لوگوں کی تکلیفوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، ایک انسان کا دوسرے انسان سے انسانیت کا بھی رشتہ ہوتا ہے یہی رشتہ ہمیں ان کی تکلیف کا احساس کراتا ہے۔ بس دعا کیجیے کہ یہ بوڑھی امّاں ٹھیک ہو جائیں۔''

''جی اللہ کرے یہ جلد ٹھیک ہو جائیں'' ڈاکٹر نے آ کر بتایا کہ آپریشن کامیاب رہا ٹانگ کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی تھی جسے جوڑ دیا گیا۔ انھیں اگلے کچھ دن تک اسپتال میں ہی رہنا ہوگا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد فراز نے صبیحہ سے کہا ''محترمہ اب آپ گھر جائیں بہت دیر ہوگئی ہے۔'' صبیحہ نے گھڑی پر نظر ڈالی تو پانچ بج چکے تھے۔

''آپ گھر نہیں جا رہے؟'' اس نے فراز سے سوال کیا۔

''نہیں میں ان کے ہوش میں آنے تک یہیں رکوں گا۔''

''ٹھیک ہے اللہ حافظ۔''

گھر پہونچتے ہی فردوس بیگم اس پر برسنے لگیں۔

''کہاں رہ گئی تھی کمبخت، تیرے ساتھ کی سب لڑکیوں کو آئے تین گھنٹے گزر گئے، اتنی دیر کیسے ہوگئی؟''

امیّ جان، آج ماہ پارہ کو پڑھانے میں دیر ہوگئی'' رافعہ جانتی تھی کہ سچ جان کر تو وہ اور آگ بگولہ ہو جائیں گی اس لیے یہ بہانہ ہی اسے سب سے مناسب لگا۔

''کیا تم اس کے گھر گئیں تھیں'' ماہ پارہ کا نام سنتے ہی فردوس بیگم کا تمام غصّہ غائب ہوگیا۔

''نہیں، لائبریری میں بیٹھ کر پڑھ رہے تھے۔''

''اے ہے لائبریری میں بیٹھ کر کیوں پڑھایا۔ اس کے گھر چلی جاتیں، میں نے کیا منع کر رکھا ہے اس کے گھر جانے کے لیے، اس کے گھر والوں کو بھی معلوم ہو جاتا کہ تم کتنی ذہین ہو مہ رخ، سمیرہ، سب کے گھر چلی جاتی ہو مگر ماہ پارہ کے گھر جاتے تمھیں نخرے آتے ہیں۔ اچھا تو یہ بتاؤ ماہ پارہ کو لینے تو شہباز آتا ہوگا۔''

''مجھے معلوم نہیں میں گیٹ تک اس کے ساتھ نہیں آئی تھی''

''کیسی الٹے سر کی لڑکی ہے اسے تو تعلقات بھی نبھانے نہیں آتے، یہ نہیں کہ کالج کے گیٹ تک اس کے ساتھ آ جائیں اس کے گھر والوں سے بھی سلام دعا کر لیں۔''

''امی جان میں کچن میں جاؤں سر درد ہو رہا ہے چائے بنالوں۔'' فردوس بیگم کی باتوں سے بچنے کے لیے صبیحہ نے سر درد کا بہانہ بنایا۔

''ہاں بنالو میرے لیے بھی بنالینا۔''

دوسرے دن جب وہ کالج کے لیے تیار ہو رہی تھی تو ایک ہی خیال اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا کہ وہ امیّ جان سے اس بوڑھی امّاں کو جا کر دیکھنے کی اجازت کیسے مانگے، اسے ماہ پارہ کا ہی بہانہ سب سے مناسب لگا اس لیے ناشتہ کے بعد اس نے فردوس بیگم سے کہا۔

''امیّ جان میں آج بھی ماہ پارہ کو پڑھانے رک جاؤں گی۔

ٹھیک ہے رک جانا''

''امیّ جان اسے اگلے کچھ روز تک پڑھانا ہوگا۔''

''اے ہے پڑھاؤ خوب پڑھاؤ میں کیا منع کر رہی ہوں۔ اور گھر جلدی آ کر کونسا تمھیں ہل چلانا ہے مگر لائبریری میں پڑے رہنے کے بجائے اس کے گھر جا کر پڑھاؤ تو بہتر ہے۔''

''امیّ جان وہ لائبریری میں ہی پڑھنا چاہتی ہے کیونکہ وہاں مختلف کتابیں میسر ہوتی ہیں۔''

''جیسی اس کی مرضی۔''

اس نے جھوٹ بول کر فردوس بیگم کو تو دیر سے آنے کے لیے

رضامند کر لیا مگر اسے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں ماہ پارہ سے ملاقات ہونے پر انھیں تمام حقیقت نہ معلوم ہو جائے اس لیے اس نے ماہ پارہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

کالج میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر ماہ پارہ پر پڑی جو اپنی دوستوں کی ٹولی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی ماہ پارہ اس سے دوسال جونیئر تھی پچھلے سال اسے صبیحہ نے ٹیوشن بھی پڑھائی تھی، وہیں شہباز نے اسے دیکھا تھا اور ان کے گھروں میں تعلقات شروع ہوئے تھے، ماہ پارہ ایک سلجھی ہوئی سمجھدار لڑکی تھی اور صبیحہ کا بے حد ادب کرتی تھی اس نے ماہ پارہ کو آواز دی ''ماہ پارہ'' وہ اپنی سہیلیوں کے جمگھٹ میں سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔ صبیحہ نے اسے سارا معاملہ سمجھا دیا۔

''''السلام علیکم''

''وعلیکم السلام، آپ آج بھی''

''آپ اتنے حیران کیوں ہیں؟''

''مجھے امید نہیں تھی کہ آپ آج بھی آئیں گی، مجھے لگا تھا بس ان بزرگ خاتون کو اسپتال تک پہونچانے ہی کو آپ اپنا فرض سمجھیں گی۔''

''کیوں کیا تمام اچھائیوں کی ذمہّ داری آپ نے لے رکھی ہے؟ میں بوڑھی امّاں کی تیمارداری نہیں کرسکتی۔'' اس بزرگ خاتون نے آنکھیں کھول کر ان دونوں کو دیکھا انھوں نے صبیحہ کو پہچان لیا مگر اس کے نام سے واقف نہیں تھیں۔

''میرا نام صبیحہ ہے۔''

''اور تمھارا کیا نام ہے'' اب وہ فراز سے مخاطب تھیں۔

''میرا نام فراز ہے۔''

''بیٹا تم دونوں ہی مجھے یہاں لائے تھے ناں، تم لوگوں کا بہت بہت شکریہ''

''امّاں شکریہ کی کیا بات ہے یہ تو انسانیت کے ناطہ ہمارا فرض ہے۔''

''بیٹا اس انسانیت کے فرض کو بھلا کتنے لوگ نبھاتے ہیں اپنے ہی جب بھول جاتے ہیں تو غیروں سے کیا امید کی جاسکتی ہے'' یہ کہہ کر وہ کسی سوچ میں ڈوب گئیں اور ان کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

''امّاں آپ آرام کریں، پریشان نہ ہوں آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہم سے کہہ دیں۔'' فراز نے ان سے کہا۔ وہ دونوں کافی دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہے اور ان کی خدمت کرتے رہے کچھ دیر کے لیے فراز اٹھ کر چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو صبیحہ کے لیے کھانے کا ایک پیکٹ لے آیا۔ شام میں پانچ بجے تک صبیحہ گھر آ گئی آج فردوس بیگم اس سے ناراض نہیں تھیں۔ گھر آ کر وہ کچن کے کام میں مصروف ہوگئی۔

کئی روز تک اسی طرح صبیحہ اسپتال جاتی رہی وہ دونوں بزرگ خاتون کی خدمت میں لگے رہتے اور جب وہ سو جاتیں تو دونوں آپس میں باتیں کرنے لگتے، فراز ایک لمبے قد کا بہت پرکشش انسان تھا آنکھیں ایسی معصوم تھیں جیسے وہ کوئی گناہ کرنے کے لیے بنا ہی نہ ہو، معمولی کپڑوں میں بھی وہ بہت پروجاہت لگتا تھا۔ گفتگو کے دوران صبیحہ کو معلوم ہوا کہ وہ بہت ہی سمجھدار اور ذہین انسان ہے اس کا تعلق ایک بہت ہی غریب گھر سے تھا مگر اس کے حوصلے بہت بلند تھے، آہستہ آہستہ اس کی باتوں میں، اس کی عادتوں میں صبیحہ کو کشش محسوس ہونے لگی اس کی ایک عادت صبیحہ کو بے حد پسند تھی کہ وہ دوسروں کی مدد کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا اور ان کے درد کو اپنا درد سمجھتا تھا۔ صبیحہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ بھی اس میں دلچسپی رکھتا ہے۔ صبیحہ اس بات کو اچھی طرح جانتی تھی کہ فردوس بیگم کبھی ان دونوں کے رشتے کے لیے تیار نہیں ہوں گی پھر بھی اس کا دل اس کی جانب کھنچا جا رہا تھا۔

بوڑھی امّاں اب گھر آ چکی تھیں مگر اب بھی ان دونوں نے ان کے پاس جانا جاری رکھا بوڑھی امّاں سے انھیں معلوم ہوا تھا کہ وہ اس گھر میں اکیلی رہتی ہیں 1971 کی جنگ میں ان کے شوہر مارے گئے تھے بیٹا بڑا ہو کر امریکہ پڑھنے چلا گیا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا، خطوں کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ اس نے وہیں شادی کر کے اپنا گھر بسا لیا۔ اس کا آخری خط آئے ہوئے بھی دس سال گزر چکے تھے اب جب بھی انھیں اپنے بیٹے کی یاد آتی تھی وہ اس

بس اسٹاپ پر جا کر بیٹھ جاتی تھیں جہاں بچپن میں وہ اپنے بیٹے کو اسکول بس میں بٹھانے جایا کرتی تھیں۔

اب بوڑھی امّاں پوری طرح سے ٹھیک ہوچکی تھیں صبیحہ نے فراز کو بتایا کہ وہ کل سے نہیں آسکے گی۔ فراز نے پریشان ہوکر پوچھا

''پھر ہم ملیں گے کیسے''

''ملنے کی کیا ضرورت ہے، آپ کا اور میرا رشتہ ہی کیا ہے۔''

''میرا اور تمھارا کوئی رشتہ نہیں ہے؟''

''کیا رشتہ ہے ہمارا، آپ ہی بتائیں؟''

''ہر بات زبان سے کہنا ضروری ہوتا ہے تمھیں میری نظروں میں اپنے لیے محبّت نہیں دکھائی دیتی، میں تو اس خوش فہمی میں تھا کہ تم میرے دل کی کیفیت سے آگاہ ہو، ''میں نے اپنا حالِ دل تمھیں بتا دیا اب میں تمھارے جواب کا منتظر ہوں۔''

''اگر آپ نظروں کی زبان سمجھتے ہیں تو میرا جواب بھی جانتے ہوں گے'' یہ کہہ کر اس نے نظریں اٹھائیں اور محبّت بھری نگاہوں سے فراز کی طرف دیکھا فراز اس محبّت بھرے لمحے کی تاب نہ لا سکا اس نے صبیحہ کے ہاتھوں کو تھام لیا اور پھر محبّت سے انھیں چوم لیا۔ صبیحہ نے حیا سے اس کے ہاتھ سے اپنے ہاتھوں کو کھینچ لیا اور تیز قدموں سے اپنے گھر کی جانب چلی گئی۔

صبیحہ گھر میں داخل ہوئی تو وہاں کا منظر ہی بدلا ہوا تھا شہباز امّاں کے پاس بیٹھ کر پان چبا رہا تھا اور وہ پاندان گھٹنے کے نیچے دبائے بیٹھی تھیں اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے سروتہ سے چھالیاں کاٹ رہی تھیں اور ان کے چہرہ کا رنگ غصّہ سے سرخ ہو رہا تھا صبیحہ پر نظریں پڑتے ہی اس پر گرجتے ہوئے بولیں ''اونا معقول لڑکی کہاں سے آرہی ہے؟'' اس سے پہلے کہ صبیحہ کوئی جواب دیتی شہباز اجازت لے کر باہر چلا گیا۔ وہ سمجھ گئی اس کا راز کھل چکا ہے اس نے خوف سے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا ''امّاں وہ بہت بوڑھی ہیں اور اکیلی بھی، ان کی تیمارداری کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔''

''تو کیا دنیا میں جتنی اکیلی بوڑھی عورتیں ہیں تو سب کی تیمارداری کرنے پہونچے گی تیری ایسی دیدہ دلیری تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ تو مجھ سے جھوٹ بول کر اس طرح لوگوں کے گھر جائے گی۔''

''امّی جان، مجھے معاف کردیں، میں آپ سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی مگر انھیں میری ضرورت تھی۔''

''آج سے تیری تمام آوارہ گردی بند، اب تو کالج بھی نہیں جائے گی تجھے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''امّاں مجھے ایسی سزا مت دیجئے، بی اے کا میرا آخری سال ہے میں وعدہ کرتی ہوں سوائے کالج کے اب کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''ہم نے تمھیں بہت آزادی دے رکھی تھی اور بی اے کر کے بھلا کونسا تمھیں نوکری کرنی ہے جو اس قدر فکرمند ہو رہی ہو۔'' یہ کہہ کر فردوس بیگم اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں اور صبیحہ بہتے ہوئے آنسوؤں کو تھامنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نے اپنے رخساروں پر کسی کا لمس محسوس کیا، یہ شہباز تھا۔ اس نے غصّہ سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' ''اس میں بدتمیزی کیسی؟ تمھارے آنسو پونچھ رہا ہوں، تمھارے ساتھ وہ انسان کون تھا؟'' اس جملے کے ساتھ شہباز کا لہجہ تھوڑا سخت ہوگیا۔

''آپ سے مطلب؟''

''مجھ سے مطلب نہیں ہوگا تو کس سے ہوگا میں نے تمہاری امّی جان کو یہ بات نہیں بتائی ہے لیکن مجھے ہرگز یہ پسند نہیں ہے کہ تم اس طرح کسی سے ملو، آئندہ خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر شہباز وہاں سے چلا گیا۔

اس کے بعد صبیحہ گھر میں قید کردی گئی فراز کو جب تمام حالات معلوم ہوئے تو اس نے اپنا رشتہ صبیحہ کے لیے بھیجا اس دن صبیحہ نے فردوس بیگم سے کتنی منتیں کی تھیں کہ وہ فراز کے والدین کی بے عزتی نہ کریں مگر انھوں نے اس کی ایک نہ سنی اور انھیں بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا تھا فراز کے بارے میں جان کر تو وہ اور زیادہ آگ بگولہ ہوگئیں تھیں پھر آناً فاناً میں انھوں نے اس کا رشتہ شہباز سے طے کر دیا۔ زندگی کے ان اوراق کو پلٹتے پلٹتے صبح ہوگئی تھی مگر صبیحہ کی زندگی کی رات باقی تھی۔

آج پورے گھر میں رونق تھی صبیحہ کی بارات آنے والی تھی وہ بے حس سی خاموش بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی اور جب قاضی جی نے اس سے شہباز سے نکاح کا سوال کیا تو اس نے بغیر احتجاج کے ہاں کہہ دیا جیسے اس نے اب اپنی بدقسمتی کو قبول کر لیا تھا۔

اب وہ شہباز کے گھر آ چکی تھی، شہباز کی پوشیدہ برائیاں بھی اس کے سامنے عیاں ہونے لگی تھیں شراب کے نشے میں رہ کر جوا کھیلنا اس کا روز کا مشغلہ تھا اور فراز کا نام لے کر اس پر ظلم کرنے میں تو اسے خاص لطف آتا تھا پریشانیوں کے اس دور میں ماہ پارہ نے ایک سچّے دوست کی طرح ہمیشہ اس کا ساتھ دیا مگر ایک دن وہ بھی رخصت ہو کر اپنے گھر چلی گئی، اس درمیان معصوم پری اس کی گود میں آ چکی تھی لیکن اس کی آمد نے بھی شہباز میں کوئی تبدیلی رونما انھیں کی تھی بلکہ اس کی عیاشیاں بڑھتی جاتی تھیں کچھ دن بعد شہباز کے والدین بھی اس فانی دنیا کو چھوڑ گئے اب اسے شہباز کے ظلموں سے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک دن اچانک بیٹھک سے شوروغل کی آواز سنائی دی صبیحہ نے جا کر دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے شہباز ہاتھ میں چاقو لیے کھڑا تھا اور اس کے کپڑے خون آلود تھے، اس کے سامنے خون میں لت پت ایک لاش پڑی تھی۔ شہباز نے شراب کے نشے میں اپنے ایک ساتھی سے جھگڑا کیا اور غصّہ میں پھل کاٹنے والے چاقو سے کئی وار اس کے پیٹ میں کر کے اسے ہلاک کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پولس آ گئی اور وہ لوگ شہباز کو لے گئے۔ شہباز کو بچانے کے لیے مقدمہ میں پانی کی طرح پیسہ بہایا گیا مگر وہ پھانسی کی سزا سے نہ بچ سکا۔

صبیحہ اب اکیلی رہ گئی تھی تمام دولت مقدمہ کی نظر ہو چکی تھی اب کھانے کی بھی تنگی تھی اس نے شہر چھوڑ کر جانے کا ارادہ کر لیا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی لوگ اس کی بیٹی کو قاتل کی بیٹی کہیں، وہ فردوس بیگم کو بھی اپنے ساتھ لے گئی۔

دوسرے شہر میں نئی پریشانیاں اس کا انتظار کر رہی تھیں اس کا بی۔اے۔ مکمل نہیں ہو پایا تھا اس لیے کوئی اسے نوکری دینے کو تیار نہیں تھا بڑی مشکل سے ایک آفس میں ٹائپسٹ کی نوکری ملی، پری اب بڑی ہو رہی تھی اس نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ وہاں اس کو کچھ ساتھی مل گئے تھے ان میں سے ایک تھی روبی، جس کا ذکر وہ اکثر اپنی ماں اور نانی سے کیا کرتی تھی صبیحہ نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ روبی کے بڑے گھر، اچھے کپڑوں اور خوبصورت کھلونوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک محرومی اس کی آنکھوں میں نظر آتی تھی صبیحہ اپنی محبّت سے پری کے اس احساسِ محرومی کو کم کرنے کی کوشش کرتی۔

ایک دن پری بیمار تھی تو روبی اسے دیکھنے آ گئی اسکی آیا بھی ساتھ آئی اس نے ان لوگوں کو بتایا۔

''اس سے پہلے ہمارے صاحب میرٹھ میں رہتے تھے ان کے والدین بہت غریب تھے ایک بوڑھی خاتون نے جن کی انھوں نے بہت خدمت کی تھی مرتے وقت اپنی تمام جائیداد ان کے نام کر دی اس شہر میں آ کر اس دولت سے انھوں نے کاروبار شروع کر دیا اللہ نے انھیں ترقی دی اور آج اس مقام پر پہنچا دیا'' کچھ دیر بعد وہ لوگ چلے گئے۔

پری کے اسکول میں سالانہ پروگرام شروع ہونے والا تھا تمام لوگ آ چکے تھے۔ پری، اس کی ماں اور نانی بھی جلدی سے اندر داخل ہوتے ہال لوگوں سے بھرا ہوا تھا ان لوگوں کو پیچھے کی قطار میں جگہ ملی۔ پرنسپل صاحب مائیک پر بول رہے تھے ''ہمارے آج کے اس پروگرام کے مہمان خصوصی ہیں جناب فراز احمد صاحب، جو ہمارے شہر کی مشہور ہستی ہیں'' یہ کہتے ہوئے پرنسپل صاحب نے اسٹیج پر بیٹھے جس شخص کی طرف اشارہ کیا اسے دیکھ کر صبیحہ اور فردوس بیگم حیرت زدہ رہ گئیں، یہ فراز ہی تھا جسے فردوس بیگم نے اپنی بیٹی کے لیے ٹھکرا دیا تھا پھر ان دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا ایسا لگا جیسے صبیحہ ان سے کہہ رہی تھی ''کاش امّی جان آپ نے میری تقدیر لکھنے کی کوشش نہیں کی ہوتی اور فردوس بیگم کی آنکھوں میں شرمندگی تھی۔

□□□

Dr. Razia Sultana
Lal Diggi, Civil Line
Aligarh-202001(U.P)
razia4357@gmail.com

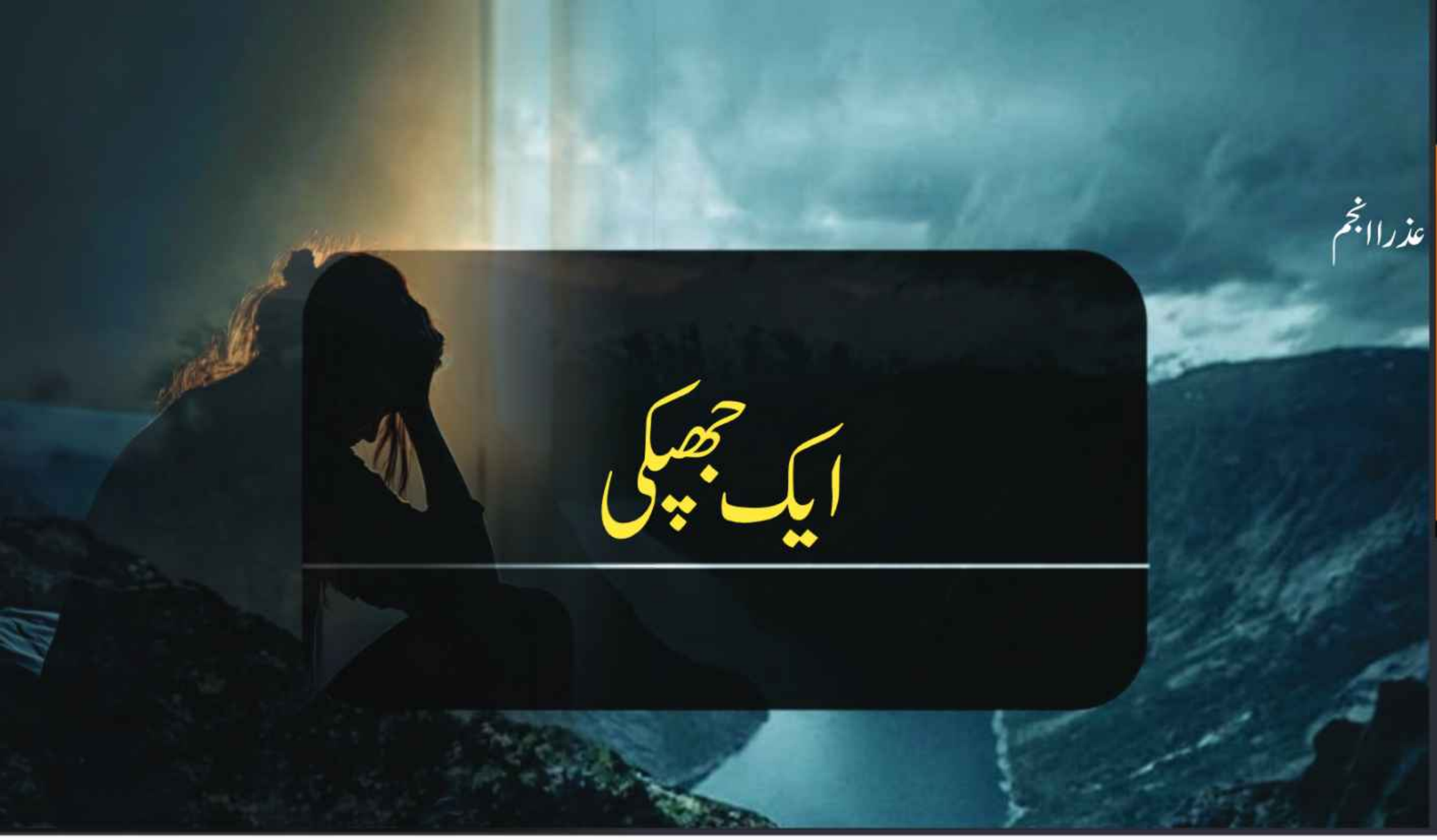

ایک جھپکی

عذرا انجم

دوپہر میں خواب قیلولہ کی عادت نوکری کے بعد تقریباً چھوٹ سی گئی تھی لیکن آج ایک عرصے بعد چھٹی کے دن ،میری دونوں سہیلیاں فاطمہ اور کلثوم کمرے پر نہیں تھیں۔ یہ اچھا موقع تھا کہ میں اپنے ساتھ معیاری وقت گزار سکوں۔آپ بھی کبھی محسوس کیجیے، اگر آپ کے کمرے میں آپ کے ساتھ آپ کے ساتھی بھی رہتے ہیں تو ان کے چھٹی پر جانے کے بعد کمرہ کتنا سکون بخش معلوم ہوتا ہے۔آپ کا کمرہ چاروں طرف سے مثبت ترنگوں کی پھوہاریں برسا رہا ہوتا ہے۔ اِنھیں پھوہاروں کی مدھم تھپکیوں سے دوپہر کے کھانے کے بعد نہ جانے کب میں نیند کی آغوش میں چلی گئی مجھے کچھ خبر نہیں۔شروع شروع میں تو بہت اچھی نیند آئی لیکن پھر ایک خواب کسی نیم پنہاں دریچے سے چپکے چپکے میرے نیند محل میں داخل ہوا اور اپنے کرتب دکھانے لگا۔ میں دیکھ رہی تھی اپنا اسکول، جہاں میرا بچپن گزرا تھا جس کے درمیانی حصے میں بڑے سے گول صحن میں چاروں طرف سجائے گملوں کے ارد گرد ہم سب دوڑتے کھیلتے پھرتے تھے ۔اسکول کے پیچھے موجود آم کا باغ جس سے اکثر ہم لوگ آم توڑ کر کھایا کرتے تھے،اُن درختوں پر کچے آموں کے گچھے لٹک رہے ہیں۔ ہمارے اسکول کے دائیں اور بائیں سمت جو خالی جگہیں تھیں،جسے ہم سب اپنے ہی اسکول کا میدان سمجھ کر کھیلتے کودتے رہتے تھے ، اُس میدان میں ،میں اپنے دوستوں شالنی ، آفتاب ، سدھیر، لکشمی ، حنا، ریتا، سونو اور مونو کے ساتھ والی بال کھیل رہی ہوں۔ میدان کے ایک کنارے پر برگد کی چھاؤں میں گول گپے والے بھیا نظر آ رہے ہیں ۔وہیں پاس میں ہی املی ، کروندے ، کمرکھ اور اماوٹ بیچنے والی آنٹی اپنی چھوٹی سی دکان سجائے مٹی کے دیے میں کپور سلگا رہی ہیں۔ ابھی یہ خواب پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دوسرا خواب اُسی خواب کے در پر نمودار ہوا اور پھر شروع ہو گیا خواب در خواب کا سلسلہ۔ میں دیکھ رہی تھی کہ دادا جان کا پرانا گھر ہے،تین طرف سے کھُلے آنگن میں میرے دادا پلنگ پر لیٹے کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ٹیبل فین کی ہوا سے کتاب کے پنوں کی سرسراہٹ ایک جانی پہچانی سی نغمگی پیدا کر رہی ہے۔دادا جان کے سرہانے ایک صندوقچہ رکھا ہوا ہے۔ غالباً یہ وہی صندوقچہ ہے جس میں دادا جان ایک طرف وہ خطوط رکھتے ہیں جو وہ لوگوں کو بھیجتے ہیں اور دوسری طرف وہ خطوط جو لوگ اُنھیں بھیجتے ہیں۔سامنے رکھی میز پر ایک بڑے برتن میں دسہری آم پانی میں بھگو کر رکھے ہوئے ہیں۔تقریباً ایک گھنٹہ ایسے ہی گزر گیا، پھر دادا جان اپنے پورے ہوش وحواس میں اُٹھے اور مجھے بلا کر کہنے لگے:

”اب آم اچھی طرح بھیگ چکے ہیں۔ان کی تاثیر بدل گئی ہوگی۔ سب مل کر کھائیں گے۔ پلیٹ اور چاقو لے آؤ!“

میں تعجب بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوں اور اپنے دل ہی

دل میں سوچ رہی ہوں کہ دادا جان تو انتقال کر گئے تھے۔ پھر خیال آیا کہ شاید میں نے اُن کے انتقال کا خواب دیکھا ہوگا یا دادا دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔ خیر کچھ بھی ہو! میرے دادا صحیح سلامت ہیں اس سے بڑی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ میں جا کر دادا جان کے قریب بیٹھ گئی اور اُن سے کہہ رہی ہوں: دادا! آپ کی بیساکھیاں کہاں ہیں؟ اس بات کو سن کر وہ پلنگ سے نیچے اُتر گئے اور مجھے چل کر دکھانے لگے۔ کہنے لگے:

''اب مجھے بیساکھیوں کی ضرورت نہیں، میں چل سکتا ہوں۔ بلکہ کل ان شاء اللہ میں تمھیں مشرقی باغ میں صبح کی سیر پر لے چلوں گا۔ تیار رہنا۔''

''میں تیزی سے آگے بڑھتی ہوں، اتنے میں نہ جانے کہاں سے ایک نقاب پوش خاتون تیز قدموں سے کار کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی اور بھائی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں بدبداتی ہوں کہ یہ نقاب پوش خاتون کون ہے؟ ایک پندرہ سولہ برس کی لڑکی جو جانے کب سے میرے برابر میں کھڑی ہے، مجھے بتاتی ہے کہ وہ بھائی کی بیوی ہے۔ میں فکر میں پڑ جاتی ہوں''

دادا کی یہ بات سن کر میں بہت خوش ہوگئی۔ میں دوڑ کر امی ابو کے کمرے میں داخل ہوتی ہوں کہ انھیں یہ خوش خبری سنا سکوں کہ دادا زندہ ہیں اور اب تو اُنھیں بیساکھیوں کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ اُن کے پیر بالکل صحیح سلامت ہیں۔ اب وہ چل سکتے ہیں۔ میں جیسے ہی امی ابو کے کمرے میں داخل ہوتی ہوں تو کیا دیکھتی ہوں کہ امی نئے گھر کے باغیچے میں امرود کے درخت کے نیچے لگے ہوئے لوہے کے جھولے پر بیٹھی ہیں۔ اُن کی دائیں جانب دو سال کا بچہ بیٹھا ہوا ہے اور بائیں جانب پانچ برس کی چنچل بچی بیٹھی موبائل دیکھ رہی ہے۔ میں اُنھیں دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتی ہوں۔ پھر جب امی سے ان دو عدد بچوں کے بارے میں دریافت کرتی ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ امی کے پوتا اور پوتی ہیں۔ میں بچوں پر پیار بھری نظر ڈالتی ہوں۔ بچے جھولے سے اُتر کر میری انگلیوں سے کھیلنے لگتے ہیں ایسے کہ جیسے مجھے صدیوں سے جانتے ہوں۔ واپس پلٹتی ہوں تو دیکھتی ہوں کہ ابو سائیکل چلاتے دور سے آتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ سائیکل کے پیچھے بڑا سا ہرا ہرا تربوز ہے جسے دیکھ کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ ارے واہ! میرا پسندیدہ پھل! میں آگے بڑھتی ہوں کہ تربوز اُٹھا لوں، تبھی ایک بچی بڑھ کر وہ تربوز اُٹھا لیتی ہے۔ میں ابو سے پوچھتی ہوں یہ بچی کون ہے؟ ابو کہتے ہیں۔ یہ ۔۔۔ یہ تو اقرا ہے، میری نواسی اور تمھاری بھانجی۔ بچی مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ اگلے ہی لمحے کیا دیکھتی ہوں کہ میرا بھائی بڑا ہو گیا ہے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے جب وہ سائیکل سیکھ رہا تھا اور آج کار بھی چلانے لگا۔ میں بھائی کو دیکھ کر خوش ہو جاتی ہوں۔ میرے کب سے ارمان تھے کہ بھائی کار چلائے اور میں آگے اُس کے ساتھ بیٹھوں۔ آج یہ ارمان بھی پورا ہو جائے گا۔ میں تیزی سے آگے بڑھتی ہوں، اتنے میں نہ جانے کہاں سے ایک نقاب پوش خاتون تیز قدموں سے کار کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی اور بھائی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں بدبداتی ہوں کہ یہ نقاب پوش خاتون کون ہے؟ ایک پندرہ سولہ برس کی لڑکی جو جانے کب سے میرے برابر میں کھڑی ہے، مجھے بتاتی ہے کہ وہ بھائی کی بیوی ہے۔ میں فکر میں پڑ جاتی ہوں، بہت یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن یاد نہیں آتا کہ بھائی کی شادی کب ہوئی۔۔۔ ابھی تو ہمارا بچپن بھی نہیں گزرا۔ جب بھائی مجھے سائیکل پر بٹھا کر اسکول لے جایا کرتا تھا تب میں سڑک پر آتی جاتی کار کو دیکھ کر یہی سوچتی تھی کہ جس دن میرا بھائی کار چلانے لگے گا میں اُس کے ساتھ آگے کی سیٹ پر بیٹھ کر لمبے سفر پر جاؤں گی لیکن آج میرا وہ دیرینہ خواب ٹوٹتا ہوا نظر آنے لگا، میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے، آنسوؤں کی ایک قطار میری حلق میں گٹھلی بن کر اٹکنے لگی۔ میرا عزیز بھائی جس پر میں بچپن سے ہی اپنا حق سمجھتی آرہی تھی، یکلخت اُس

طرف تیز قدموں سے بڑھتی ہوں لیکن بھائی ! وہ تو میری کیفیت سے انجان تھے شاید، انھیں میری موجودگی کا احساس بھی نہ ہوا، اسی لیے تو اُنھوں نے کار اسٹارٹ کی اور اگلے ہی لمحے زمین پر چاروں پہیوں کی رگڑ سے پیدا دھول میری آنکھوں کے سامنے ایک دھندلکا بنانے لگی ، اس سے بھی گہری ایک دھندلک میرے آنسوؤں میں لبریز سامنے نظر آرہی چیزوں کو اوجھل کر گئی۔ آنسوؤں کی گٹھلی ہچکی بن کر حلق سے باہر نکلی اور ہوا میں اپنا دم توڑنے لگی۔ میرے خواب کی تعبیر کبھی گہرے سمندر میں ڈوبتی نظر آتی تو کبھی انجانے دھندلکوں میں ابھرتی ، ڈوبتی اوجھل ہونے لگتی ۔ بھائی کو کار چلاتے ہوئے دیکھ کر مجھے ایسا لگا تھا کہ میں اپنی منزل کے بے حد قریب پہنچ چکی ہوں لیکن جب اُس منزل پر کسی اور کو کھڑا دیکھتی ہوں تو اپنی نا رسائی پر کفِ افسوس ملتی رہ جاتی ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر بھائی کار پہلے ہی سیکھ جاتا، کیا ہی بہتر ہوتا اگر میں جلدی جلدی اپنے قدم بڑھا کر کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ جاتی ، کاش یہ ہو جاتا ، کاش وہ ہو جاتا۔ کیوں ہمیشہ میرے ساتھ ہی ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی چیز کے پیچھے جی جان لگا تی ہوں تو وہ چیز مجھ سے اور زیادہ دور ہونے لگتی ہے۔ابھی یہ خواب بھی اپنی انتہا کو نہیں پہنچا تھا کہ میں دوبارہ ایک خواب نما کوئیں کے اندر پھسلتی چلی گئی۔ میں کینٹین میں مومو ز اور پاستا لیے بیٹھی ہوں ۔میرا دوست ذیشان کولڈ کافی لے کر میری ہی طرف بڑھ رہا ہے۔ دیر تک ہم دونوں خوش نما موسم اور پڑھنے لکھنے کی باتیں کرتے رہے پھر دوستوں کی چغلیاں شروع ہو گئیں۔نعمان نے ایسا کہا،مکیش نے ویسا کہا۔فلاں دوست نے تو میری جاب پر مجھے مبارک باد تک نہیں دی بلکہ جب میں نے اسے اپنی نوکری ہو جانے کی خبر دی تو ایسا لگا کہ اُس کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ نیلو نے مجھ سے میری نوکری ہو جانے کی خوشی میں دعوت لی اور جب وقت آیا تو اپنے ساتھ اپنے چار دوستوں کو اور لے آئی ۔ دعوت بھی اُڑائی اور اُس کے بعد کہتی ہے کہ بہن! تو اس میں کون سی بڑی بات ہے؟ ویسے بھی تیری یہ نوکری مستقل تو ہے نہیں ۔ ایسی جاب کا کوئی بھروسہ نہیں آج ہے کل نہیں ۔کہتے کہتے میرے چہرے پر اُداسی کے بادل چھانے لگے ۔میری اُداسی محسوس کر کے ذیشان نے کہا: دنیا ایسی ہی ہے،مثبت چیزوں پر بھی اپنے منفی اثرات چھوڑتی ہے۔۔۔تم بھی کہاں ان باتوں میں آ گئیں؟ وہ دیکھو قوس قزح۔ اگر بارش آ جائے تو سونے پہ سہاگا ہو جائے۔ میں نے بھی دھنک کے سات رنگ دیکھے تو اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ابھی ہماری باتیں چل ہی رہی تھیں کہ کالی گھٹا چھانے لگی اور بارش کے آثار بننے لگے۔ننھی ننھی بوندیں آپس میں باتیں کرتی ہوئی ہم دونوں کی گفتگو میں چپکے چپکے شریک ہونے لگیں۔رم جھم بارش دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش میں تبدیل ہو گئی ۔ دور دور تک درخت ہی درخت ۔ہوا کا رخ کبھی مشرق کبھی مغرب ،کبھی شمال تو کبھی جنوب ،غرض کہ چومکھی بارش اُمس والی گرمی میں سردی کا احساس دلانے لگی۔ سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں۔ ہم دونوں رفتہ رفتہ آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔تھوڑی دور تک چلنے کے بعد خوشبو اور نہاں نظر آئیں، دونوں بارش میں شرابور۔ پھر ہم کیوں پیچھے رہتے ،ہم سب مل کر خوب بھیگے، بارش کی بوندوں کو چلو میں اکٹھا کر کے ایک دوسرے پر اچھالتے رہے۔کبھی یکلخت درختوں کے ہجوم سے نکل کر ہم چاروں چٹیل میدانوں میں پہنچ جاتے ،تو کبھی رنگ برنگ بادلوں میں ایسے ہی بارش میں پہاڑوں پر پہنچ گئے۔اب ہم پہاڑ پر اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ ہم سب کھیل میں مگن تھے کہ اچانک سے میرا پیر پھسلا اور میرے تین دوستوں میں سے کوئی بھی مجھے گرنے سے بچا نہ سکا،ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بہت اونچائی سے کسی گہری کھائی میں گرتی ہی چلی جا رہی ہوں...جب آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہوں کہ میں خواب دیکھتے دیکھتے تختہ خواب سے نیچے گر گئی ہوں اور فاطمہ اور کلثوم مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہیں۔

❐❖❐

Azra Anjum
G9/10 Batla House,
Allama Iqbal Road
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi -110025

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ویر ساورکر اور تقسیم ہند کا المیہ

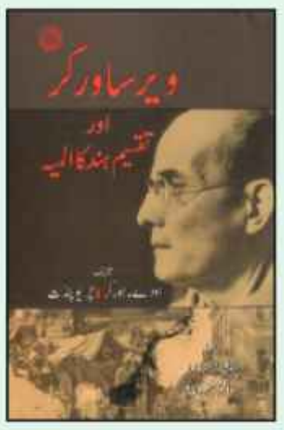

تالیف: اودے ماہورکر، چرایو پنڈت

مترجم: پروفیسر مظہر آصف، ڈاکٹر مسعود عالم

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 385+xxxviii

قیمت: 240 روپے

ہندوستانی مسلمان: اتحاد کی بنیاد حب الوطنی

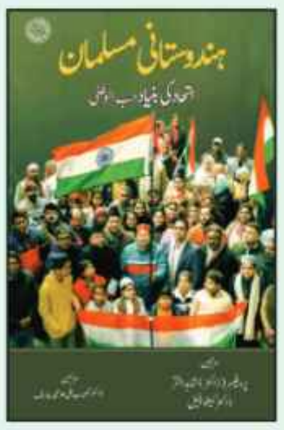

مرتبین: پروفیسر (ڈاکٹر) شاہد اختر

ڈاکٹر کیشو پٹیل

مترجمین: ڈاکٹر نصیب علی، محمد عارف

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: xl+211، قیمت: 150 روپے

کلیاتِ سعادت حسن منٹو (جلد دوم)

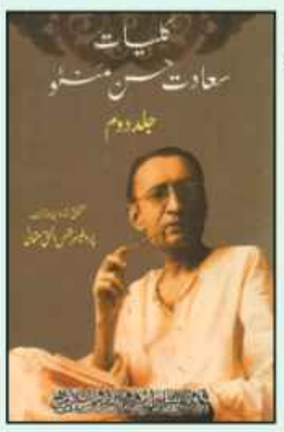

تحقیق، تدوین و ترتیب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

تیسرا ایڈیشن: 2025

صفحات 23+576

قیمت: 305 روپے

ٹیگور بتیسی (ٹیگور کے بتیس افسانوں کا انتخاب)

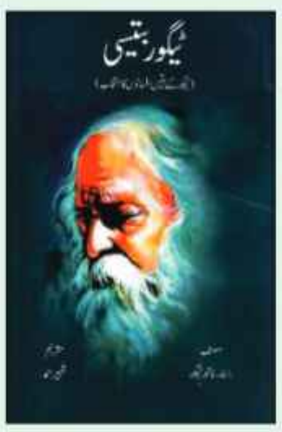

مصنف: رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم: شبیر احمد

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 65+510

قیمت: 300 روپے

مرزا غالب: ایک سوانحی منظر نامہ

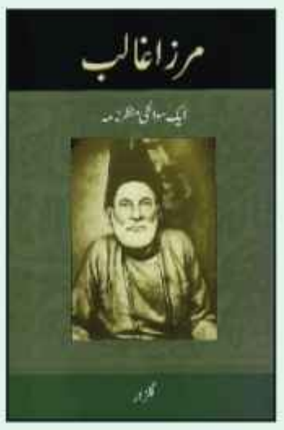

مصنف: گلزار

دوسرا ایڈیشن: 2025

صفحات: 23+247

قیمت: 160 روپے

نقوشِ کلام (سوانح حیات ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام)

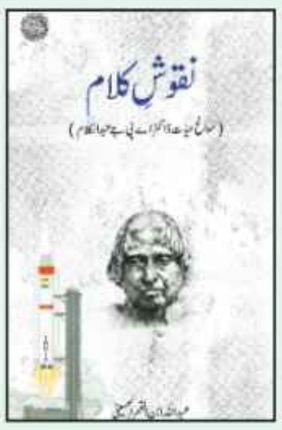

مصنف: عبداللہ ابن القمر الحسینی

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 20+460

قیمت: 255 روپے

Let's Learn Urdu
Beginner's Mannual for Urdu Script

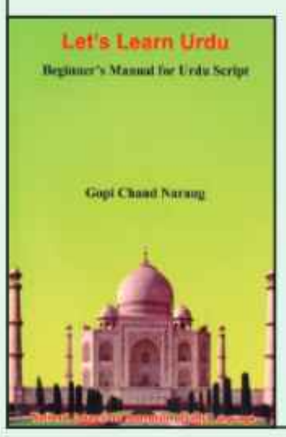

مصنف: گوپی چند نارنگ

ساتواں ایڈیشن: 2025

صفحات: 111

قیمت: 65 روپے

Work Book: Let's Learn Urdu
Beginner's Mannual for Urdu Script

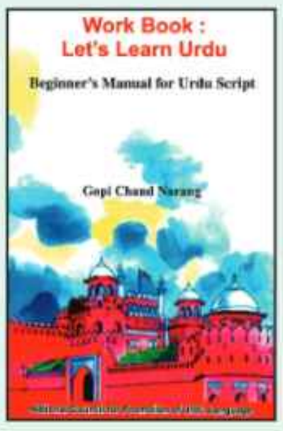

مصنف: گوپی چند نارنگ

ساتواں ایڈیشن: 2025

صفحات: 76

قیمت: 50 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक,अप्रैल- २०२६ वर्ष:१०, अंक: ४

Mahnama Khawateen Duniya Monthly April 2026, Vol.10, Issue:4

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-04-2026
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B-127, Sector 65, Noida-201301 (U.P)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025